قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ
۴
چار روپے

ٹیلیفون

خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ لاہور

بدل اشتراک
سالانہ
پاکستان ——— ۴۸ روپے
غیر ممالک ——— ۱۱۰ روپے

جلد (۴۰)

اگست ۱۹۸۷ء

نمبر ۸

فہرست

۱۔ لمعات ۲

۲۔ رابطہ باہمی ۱۲

۳۔ محترم پرویزؒ صاحب کا پیغام ۱۳
محترم محمد اکرم راٹھور کراچی

۴۔ حفظِ امانت (محترمہ ثریا عندلیب) ۳۳

۵۔ بزم مذاکرہ ۳۷
(طلوعِ اسلام کنونیشن ۱۹۸۷)

۶۔ تھیاکریسی (محترم حسن عباس رضوی) ۴۹

۷۔ حقائق و عبر ۵۳
۱۔ شریعت بل اور ممتاز قانون دان
۲۔ ہزاروں لاکھوں احادیث
۳۔ ادارہ تحقیقات اسلامی
۴۔ سرحد پار عائلی قوانین کی صدائے بازگشت
۵۔ جماعت اسلامی اور علماء

۸۔ افکارِ پرویزؒ کی صدی ۵۷
(محترم محمد اسلام کراچی)

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبدالحمید۔ مقامِ اشاعت: ۲۵/بی، گلبرگ لاہور۔ مطبوعہ: النور پرنٹرز، ۴/۲ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور۔

لمعات

۱۴ اگست

احتساب اور تجدیدِ عہد کا دن

مطالبۂ پاکستان کے محرکات

۱۴ اگست کے حوالے سے احتساب اور تجدیدِ عہد کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ مطالبہ پاکستان کے محرکات کیا تھے۔ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد مختصراً ان عوامل پر تھی کہ

۱۔ ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کی اقلیت نہیں بلکہ ایک علیحدہ اور مستقل قوم ہیں۔

۲۔ مسلمانوں کا دین (اسلام) ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے، جو زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ لہٰذا وہ اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

اسی سلسلہ میں مشاہیرِ اسلام، سرسید احمد خانؒ، علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے نظریۂ پاکستان کی بار بار وضاحت کی کہ نظریۂ پاکستان کا سرچشمہ دو قومی نظریہ ہے جسے آج سے چودہ سو سال پہلے اللہ تعالیٰ نے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے بذریعہ وحی یوں بیان فرمایا تھا:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۶۴/۲

"خدا وہ ہے جس نے تم سب انسانوں کو پیدا کیا پھر تم انسانوں میں (تصورِ حیات کی بنا پر) دو گروہ بن گئے، یعنی ایک مؤمن اور دوسرے کافر (غیر مسلم)"

یہی نہیں بلکہ مومنوں کے لیے ضروری قرار دیا کہ

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ ۵/۴۸

"جو کچھ اللہ تعالےٰ نے نازل کیا ہے (قرآن) اُسکے مطابق حکومت قائم کرو"

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۵/۴۴

"اور جو قانونِ الٰہی (قرآن) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں"

گویا مومن وہ ہوئے جو قرآنِ حکیم کے مطابق حکومت قائم کریں اور اس کے مطابق انفرادی اور اجتماعی فیصلے کریں، اور کافر (غیر مسلم) وہ ٹھہرے جو قرآنِ حکیم کے مطابق حکومت قائم نہ کریں۔ چنانچہ بانیٔ پاکستان قائدِاعظم محمد علی جناحؒ نے نومبر ۱۹۴۵ء میں ایڈورڈ کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

"........ ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری رہنمائی کرتا ہے، ہم اس ضابطے کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔"

اگست ۱۹۴۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کو انٹرویو دیتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

"........ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لیے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔"

تلخ حقیقت اللہ کے فضل و کرم سے قراردادِ پاکستان (جسے قرارداد لاہور بھی کہتے ہیں) کے مطابق ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔ لیکن یہ تلخ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ چالیس سال ہونے کو آئے ہیں پاکستان کے اندر، عہد کے مطابق، قرآن کا وہ نظام نافذ نہیں ہو سکا، جس کے لیے اس خطۂ ارض کا مطالبہ کیا گیا تھا، حالانکہ اس نظام کے حدود و خطوط قرآنِ حکیم کی صورت میں جگمگ جگمگ کرتے موجود ہیں۔ انہیں کہیں باہر سے درآمد (IMPORT) کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ کیا یہی انداز ہوتے ہیں زندہ قوموں کے؟ کیا یہی سلوک ہوتے ہیں خدا سے باندھے ہوئے عہد یعنی پیمانِ وفا کے؟ اس غفلت اور تاخیر سے ان گنت قیامتوں نے جنم لیا جن کی نشاندہی طلوعِ اسلام مدت سے کرتا چلا آرہا ہے مگر اس طرف دھیان نہ دیا گیا اور بات بگڑتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ نظریاتی انحطاط کی وجہ سے ملکِ عزیز کی سالمیت خطرہ میں پڑ گئی۔ ان وجوہات کی بنا پر، طلوعِ اسلام، اپنے وسائل کے مطابق چالیس سال سے پاکستان کے محرکات کو اسی شدت سے دہراتا چلا آرہا ہے کہ ؏

زباں تھک گئی داستاں کہتے کہتے

مگر اسے کہنِ نفس کہیئے یا آشوبِ چشم کہ اُن لوگوں کو جنہوں نے پاکستان کو دل سے تسلیم نہیں کیا، ان کی صورت دھندلی نظر آتی ہے۔ تعصب اور احساسِ کمتری (INFERIORITY COMPLEX) کی بنا

پر مطالبۂ پاکستان کی طرح طرح کی تاویلیں کرتے ہیں۔

پاکستان کا ازلی دشمن

اس سلسلہ میں حال ہی میں عوامی نیشنل پارٹی کے سربراہ خان عبدالولی خان نے یہ تاویل کی ہے کہ

"قائداعظم خود سرمایہ دار خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور کھوجے اور بوہرے خاندان چونکہ انڈیا کے برلا اور ٹاٹا سرمایہ دار خاندانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، اس لیے انہوں نے پاکستان بنانے کا مطالبہ کیا جبکہ مسلم لیگ کی اس ملک میں جڑیں ہی موجود نہ تھیں"

(جنگ مورخہ ۲۵ جون ۱۹۸۷ء کالم ۵-۴ صفحہ اول و کالم ۳ صفحہ ۴)

ایسے شخص کے بارے میں کچھ کہنا، جو عقل و بینش، فہم و ادراک اور بصارت و بصیرت سے محروم ہو، اور جس کا حافظہ بھی کند ہو گیا ہو، وقت کا ضیاع ہے۔ وہ ہمیشہ سے ایسی باتیں کرنے کے عادی ہیں۔ یہ وہی ولی خان ہیں جنہوں نے سقوطِ ڈھاکہ کے بعد، اکتوبر ۱۹۷۲ء کو برمنگھم فورڈ میں پاکستانیوں کے ایک منتخب اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کی باتیں، ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں۔ ۲۵ سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریہ پاکستان غلط تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت اس نظریہ کو غلط طور پر اساس بنایا گیا۔ لیکن کسی بھی قوم کو زیادہ دیر تک محض جذباتی نعروں سے بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا..... مونٹ بیٹن نے جب اپنے اختیارات پاکستان کے گورنر جنرل کو تفویض کیے تھے تو ہم نے اُس وقت بھی اس کی مخالفت کی تھی۔ اُس وقت ہمیں غدار کہا جاتا تھا۔ لیکن آج دنیا نے دیکھ لیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا اور اور اسلام ہی کے نام پر ٹوٹا ہے۔"

(نوائے وقت، ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

آپنے غور کیا کہ نظریۂ پاکستان تو کجا، ولی خان نے اسلام پر رقیق حملہ کیا ہے کہ "اسلام کی باتیں، ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں"۔ اس پر ہمارا تبصرہ یہی ہے کہ ایسے نظریات رکھنے والے اپنے آپ کو مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں۔ رہا سوال ملک کے وجود اور اُس کی بقا کا تو طلوع اسلام اس حقیقت کو بھر دُہراتا ہے کہ مملکتِ پاکستان کے سینہ کا یہ زخم رستے رستے ناسور بن رہا ہے اور اگر اس کے مداوا کی طرف فوری توجہ نہ دی گئی تو یہ مہلک ثابت ہوگا۔

احتساب

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۷/۱۷۶

انہیں ان کی داستان سناؤ تاکہ وہ سوچیں (کہ ہم نے اللہ تعالےٰ سے کیا عہد باندھا تھا

جب ہمارے عہد پر انحصار کر کے اللہ تعالیٰ نے ہمیں پاکستان عطا کیا تو ساتھ اس ابدی حقیقت کی بھی یاد دہانی کرائی کہ

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ [۱۰/۱۴]

"پھر ہم نے سابقہ حکمرانوں کے بعد، زمامِ اقتدار تمہارے ہاتھ میں دے دی تاکہ دیکھا جائے تم کیا کرتے ہو۔

ساتھ یہ تاکید بھی کی کہ

اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْــُٔوْلًا [۱۷/۳۴]

"عہد کو پورا کرنا ہوگا کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی"

اب وقت آگیا ہے کہ بارگاہِ الٰہی سے آواز آئے کہ

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۭ [۱۷/۱۳-۱۴]

تو اپنا اعمالنامہ خود آپ پڑھ۔ آج تو اپنے خلاف خود اپنا محاسب آپ ہے۔ کسی دوسرے محاسب کی ضرورت نہیں۔

یہ حساب افراد ہی کا نہیں ہوتا۔ قانونِ مکافات کی رو سے قوموں کے اعمال کا بھی محاسبہ ساتھ کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ سورۃ طلاق میں ہے کہ

کتنی قومیں ایسی تھیں جنہوں نے احکاماتِ خداوندی اور پیغاماتِ رسالت سے سرکشی برتی تو ہم نے اُن کا سخت محاسبہ کیا اور اُنہیں تباہ کن عذاب کا مزہ چکھایا [۶۵/۸]

عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے پوچھ رہا ہو کہ مطالبۂ پاکستان کے وقت، پاکستان کے اندر قانونِ الٰہی کے نفاذ کا جو عہد کیا گیا تھا اس کا حساب دو۔ لیکن اِدھر کیفیت یہ ہے کہ

عشق کی تیغ جگر دار اُڑا لی کس نے؟ علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

نہ دو قومی نظریہ کے تحفظ کے لیے کچھ کیا گیا اور نہ ہی چالیس سال میں قرآن کا نظام نافذ ہوا۔

گفتگو کے آغاز میں مطالبۂ پاکستان کے انہی تین محرکات کا ذکر کیا گیا تھا جو مطالبۂ پاکستان کی بنیاد تھے۔ ان کے علاوہ کئی تضمنات ایسے ہیں جو گوشۂ تنہائی میں منہ چھپائے بیٹھے ہیں۔ اگرچہ اُن کا حشر بھی اسی قسم کا ہو چکا ہے۔ ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں جس پر عصرِ حاضر کا نوجوان یہ پوچھنے میں حق بجانب ہے کہ

تھی اگر مے سے صراحی تیری خالی ساقی تو چراغِ درِ میخانہ جلایا کیوں تھا

یوں اگر شورشِ ایام سے دب جانا تھا کوچۂ عشق میں کیا کام تھا آیا کیوں تھا

قانونِ مکافات

اللہ تعالےٰ کا قانونِ مکافات کسی قوم سے رعایت نہیں کرتا۔ لیکن وہ اپنے قانونِ مہلت کے مطابق قوموں کی تباہی کو ایک معین مدت تک مؤخر کر دیتا ہے تاکہ انہیں تباہی سے سامانِ حفاظت مل جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے کہا ہے وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ ۱۴/۱۰ اور پھر فرمایا "اگر خدا نے پہلے ہی سے قانونِ مہلت مقرر نہ کر دیا ہوتا تو غلط عمل کے ساتھ ہی تباہی آجایا کرتی۔ لیکن اُسی نے عمل اور اُس کے نتیجہ کے درمیان مہلت کا عرصہ مقرر کر رکھا ہے ۱۴/۴۲ یاد رہے مہلت کا وقفہ اس لیے ملتا ہے کہ انسان آخری تباہی آنے سے پہلے اس سے بچنے کا سامان کرے۔ لہٰذا پیشتر اس کے کہ ہماری "اجل" کی آخری سرحد آجائے،

تجدیدِ عہد

ہم اللہ تعالےٰ سے اپنی کوتاہیوں کا اقرار کرکے، دامنِ عجز پھیلا کر توبہ کرلیں کہ اے پروردگار! ہمیں کچھ مہلت دے دے کہ تجھ سے باندھے ہوئے عہد کو پورا کر سکیں اور پاکستان کے اندر اُس قرآنی نظام کو پوری طرح نافذ کر سکیں کہ جس کے لیے تو نے یہ خطۂ ارض ہمیں عطا کیا تھا۔ جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا۔ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اب ہم اس کا اعادہ نہیں کریں گے۔ اس طرح آئندہ کے لیے ہمیں عہد کرنا چاہیے کہ اللہ سے باندھے ہوئے عہد کی ایفا کریں گے اور جس نظام کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا تھا، بلا مزید تاخیر اُسے ہر قیمت پر نافذ کیا جائیگا تاکہ اس طرح ہماری توبہ قبول ہو سکے۔

۲۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ

قرآنِ حکیم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُس کی بیان کردہ حقیقتیں ابدی، غیر متبدل اور عالمگیر ہیں وہ نہ تو زمان و مکاں سے مشروط ہیں اور نہ ہی کسی دیار و امصار سے وابستہ۔ ان کا پھیلاؤ ارض و سمٰوٰت کی بیکراں وسعتوں کو محیط ہے۔ تاہم ان کا اطلاق، ماضی کے مخصوص حالات کے تحت اُن سرکش قوموں اور مملکتوں پر بھی ہوا جنہوں نے قانونِ الٰہی سے اعراض برتا۔ اور اس نافرمانی کی پاداش میں دردناک عذاب سے ہمکنار ہوئیں۔ یہ قانونِ الٰہی کی ابدیت اور عالمگیریت کا تقاضا تھا۔ ان سوختہ بخت اقوام کی مثال بھی قرآنِ حکیم نے بیان کر دی ہے۔ جہاں اُس نے یہ کہا ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ ۳۰/۴۱ دنیا میں ہر جگہ فساد رونما ہو چکا ہوا تھا جو لوگوں کے اپنے غلط اندازِ فکر اور اعمال کا نتیجہ تھا۔ خدا کی طرف سے نہیں تھا۔ ثبوت چاہیئے تو سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ

عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ط كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُشْرِكِيْنَ ۳۰/۴۲ دنیا میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جو قومیں تم سے پہلے گزری ہیں ان کا انجام کیا ہوا اِن میں اکثریت اُن کی تھی جنہوں نے اپنے خود ساختہ قوانین کو، قوانینِ خداوندی کا ہمسر بنا رکھا تھا اور یہ شرک تھا۔

خلاصہ یہ کہ (۱) دنیا میں ہر طرف فساد پھیل چکا تھا (۲) یہ خُدا کی طرف سے نہیں تھا (۳) بلکہ یہ سب کچھ اُن کا اپنا کیا دھرا تھا (۴) ایسی قومیں اس طرح صفحہ ہستی سے مٹ گئیں کہ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ ۴۴/۲۹ کہ اُن کے اس انجام پر نہ تو آسمان رویا اور نہ ہی زمین وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ اور نہ ہی اُنہیں مہلت ملی وَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۲۳/۴۴ تاریخ کے صفحات پر فقط اُنکی داستان باقی رہے گی۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ فساد کی تعریف کیا ہے۔

(۱) حرث ونسل کی تباہی ۲/۲۰۵

(۲) معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنا ۷/۸۵، اور ماپ تول کو پورا نہ رکھنا ۲۶/۱۸۳

(۳) صالح نظام کو درہم برہم کرنا اور صحیح ترتیب کو الٹ دینا ۲۷/۳۴

(۴) ارتکاب جرم ۱۲/۷۳

(۵) معاشرہ کا توازن بگاڑ دینا اور ناہمواریاں پیدا کر دینا ۷/۵۶

(۶) حکمتِ فرعون یعنی ملک میں پارٹیاں پیدا کر دینا ۲۸/۴ وغیرہ وغیرہ

مختصراً یہ کہ اللہ تعالےٰ نے جو پروگرام اِنسانوں کے لیے (بذریعہ وحی) تجویز کیا ہے اُس کی خلاف ورزی کو فساد کہا گیا ہے۔ اِنسانوں کی اپنی زندگی میں انتشار اور معاشرہ میں بدنظمی یہ سب فساد کی شکلیں ہیں۔ اندازہ لگایئے کہ اس ایک لفظِ فساد کے اندر کس قدر ابنائے ابلیس چھُپے ہوئے ہیں۔

ماضی سے ہٹ کر جب ہم حال کی طرف آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس وقت پورے کا پورا کرۂ ارض فساد کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ کیا ترقی یافتہ قومیں، کیا ترقی پذیر ممالک سب کے سب فسادات کی لپیٹ میں ہیں۔ انسانیت اپنے ہی ہاتھوں سے بھڑکائی ہوئی آگ کے خوف سے ہانپتی کانپتی پناہ کے لیے غاروں کا رخ کیے ہوئے ہے کہ شاید ان ویران جگہوں میں اُسے آسودگی کا سانس میسر آجائے۔

اِن فسادات کی تمام تر ذمہ داری اُن سُپر طاقتوں پر عائد ہوتی ہے، جنہوں نے کرۂ ارض کے انسانوں اور مملکتوں کو اس طرح مختلف کیمپوں میں تقسیم کر رکھا ہے کہ وہ پھر کبھی بھی ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ یہی وہ تفرقہ ہے جس سے فساد جنم لیتا ہے۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے یہ ایک نظریاتی ریاست ہے جس کا ہم نے اس لیے مطالبہ کیا

تھا کہ ہم اس میں قرآن کا قانون نافذ کریں گے، جو امن اور سلامتی کا ضامن ہوگا۔ افسوس! وہ تو نہ ہوسکا اور جو ہوا وہ ہے تخریب اور شکست و ریخت کی جولانگاہ! اس کی مثال پاکستان کے اندر پے در پے بموں کے دھماکے ہیں۔ اگرچہ یہ پہلے بھی اِکا دُکا ہوتے رہتے تھے، مگر اب تو انتہا ہوگئی ہے۔ حال ہی میں لاہور، راولپنڈی اور کراچی میں بموں کے جو دھماکے ہوئے وہ اتنے شدید تھے کہ اُن کی مثال نہیں ملتی۔ ان کا مختصر حال یوں ہے۔

"لاہور۔ ۵۔جولائی ۱۹۸۷ء۔ ایک اخباری خبر کے مطابق لاہور میں تین دھماکے۔ ۶ افراد ہلاک، ۲۰ سے زائد زخمی، پہلا دھماکہ ریلوے اسٹیشن کے باہر ٹیکسی سٹینڈ پر ہوا۔ اس میں زخمی ہونے والوں کو ہسپتال لے جایا جارہا تھا کہ پلیٹ فارم نمبر ۲ پر دوسرا دھماکہ ہوا تیسرا دھماکہ بس سٹینڈ بادامی باغ ہوا کئی افراد کے اعضا جسموں سے الگ ہوگئے۔ دھماکہ سے دھواں پھیل گیا، گاڑی میں سوار متعدد افراد بھی زخمی ہوئے۔ مرنے والوں میں تین عورتیں، دو بچے اور ایک نوجوان شامل ہے۔ چار بسوں کو نقصان پہنچا..... تینوں دھماکے دس دس منٹ کے وقفے سے ہوئے پہلا دھماکہ ۱۲ بج کر ۲۵ منٹ پر ریلوے اسٹیشن کے باہر ہوا، دوسرا ۱۲ بج کر پینتیس منٹ پر پلیٹ فارم نمبر ۲ (ریلوے اسٹیشن کے اندر) اور تیسرا دھماکہ ۱۲ بج کر پینتالیس منٹ پر بادامی باغ لاری اڈہ میں ہوا۔

(جنگ ۶۔جولائی ۱۹۸۷ء۔ پہلا صفحہ)

کراچی۔ ۱۴ جولائی ۱۹۸۷ء ایک اخباری رپورٹ کے مطابق

"کراچی میں دھماکے، ۷۲ افراد ہلاک سینکڑوں زخمی، ہولناک آتشزدگی ۳۰ منٹ کے اندر ہونے والے چار دھماکوں کے بعد صدر کا فیشن ایبل اور گنجان علاقہ قبرستان بن گیا، دکانیں اور عمارتیں ملبہ کے ڈھیر بن گئیں، دکاندار، گاہک اور راہگیر لاشیں بن کر فضا میں بکھر گئے، پورے علاقہ میں گیس اور بجلی کی سپلائی بند کردی گئی۔ آگ، خون اور دھوئیں کی فضا میں مائیں بچوں کی تلاش میں بین کرتی رہیں بچے ماؤں کی تلاش میں چلاتے رہے۔ کار پارکنگ اور سڑکوں پر کھڑی تمام گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں تباہ لوگ خوفزدہ ہوکر اُونچی عمارتوں سے کود گئے"

(جنگ مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۸۷ء پہلا صفحہ)

رپورٹ کے مطابق دو دھماکے بوہری بازار اور دو دھماکے برہان الدین روڈ پر ہوئے۔ اس سانحہ کے سلسلہ میں سندھ میں تین دن تک سوگ منایا گیا اور اس کے تتبع میں ملک بھر میں ہڑتالیں اور مظاہرے ہوئے۔ بعد میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۷۷ بتائی گئی ہے۔ یہ علاقے کراچی کے مصروف ترین مراکز اور

...ں ۔ دمساکن ہیں۔ وحشت و بربریت، سفاکی و سبعیت کا یہ خونچکاں منظرِ انسانی زندگی کی ایک بھیانک ... خون آشام داستان ہے جسے ہم نے دل پر پتھر رکھ کر تحریر کیا ہے۔ وگرنہ ان حقائق کو معرضِ تحریر ... میں ... نے کے لیے نہ تو ہاتھ دماغ کا ساتھ دیتا تھا اور نہ ہی دماغ ہاتھ کا!

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں حکومت کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ قرآن حکیم کی رو سے حکومت کا تصور یہی ہے کہ وہ قانون الٰہی (قرآن) کی قوتِ نافذہ ہوتی ہے۔ اور دوسرے امور کے علاوہ لوگوں کے جان و مال کی حفاظت اور سلامتی کا ذمہ لیتی ہے۔ اس لیے یہ حکومت کا فرضِ اولین ہے کہ وہ ایسا بندوبست کرے کہ مملکت کا نظم و نسق درہم برہم نہ ہونے پائے۔ تاکہ عوام اپنے آپ کو محفوظ محسوس کریں، مگر یہاں کیفیت یہ ہے کہ ہر فرد اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ حفاظتی اقدامات تو کجا ہم حفاظتی رجحانات سے بھی واقف نہیں۔ اس لیے ہم اس وقت حرکت میں آتے ہیں جب کوئی واقعہ ہو چکا ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ پھر کہا جاتا ہے کہ سب بندوبست کر لیا گیا ہے کہ آئندہ ایسا نہ ہو، مگر پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر حفاظتی اقدامات کر لیے گئے، تو پھر اس قسم کے بھیانک تخریبی واقعات کیوں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ بفرضِ محال حکومت کسی نتیجہ پر پہنچتی ہے، تو متعلقہ تخریبی مراکز و عناصر آج تک کیوں منظر عام پر نہیں لائے گئے۔ کیا عوام کو اعتماد میں لینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت علیم و خبیر ہے (۳۵/۴)۔ اس لیے جو جماعت یا فرد قانونِ الٰہی کی قوتِ نافذہ کی ذمہ داری لیتا ہے وہ اس صفت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے سامنے شام کے ویرانے کی اُس بڑھیا کا واقعہ آتا ہے جس نے خلیفۂ وقت کی ذمہ داریوں کو جلا بخشی۔

"آپ (حضرت عمرؓ) شام کے سفر سے واپس آ رہے تھے تو راستہ میں ایک خیمہ دیکھا...... قریب گئے تو دیکھا کہ اس میں ایک بڑھیا بیٹھی ہے۔ پوچھا کہ تمہیں عمرؓ کا بھی کچھ حال معلوم ہے۔ اُس نے کہا سنا ہے وہ شام سے چل پڑا ہے۔ اس سے زیادہ نہ مجھے اس کی بابت کچھ علم ہے، نہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ نے پوچھا کہ ایسا کیوں؟ اس نے کہا کہ جس نے آج تک یہ معلوم نہیں کیا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے، میں اس کے حالات معلوم کر کے کیا کروں گی؛ آپ نے کہا کہ تم نے عمرؓ تک اپنی حالت کی اطلاع پہنچائی تھی! اس نے کہا کہ یہ میرا کام نہیں تھا۔ عمر کا کام تھا آپ نے کہا کہ عمر کو اتنی دور کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے! اس کے جواب میں اُس بڑھیا نے کہا۔

"اگر عمرؓ اپنی رعایا کے ہر فرد کے حالات کا علم نہیں رکھتا تو اُسے حکومت کرنے کا کیا حق

حاصل ہے۔" (شاہکارِ رسالت)

حضرت عمرؓ جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتے تو آنکھوں میں آنسو آجاتے اور کہتے کہ خلافت کا مفہوم کیا ہے، مجھے شام کی اُس بڑھیا نے بتایا!

تصریحاتِ بالا کی روشنی میں ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ للہ اس لامتناہی سلسلۂ تخریب کا سدِباب کیا جائے تاکہ آئندہ پاکستان کا ہر شہری اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرے۔ کیونکہ قرآن کریم کی رُو سے یہ حکومت کی اولین ذمہ داری ہے۔

بقیہ افکارِ پرویز کی صدی

صفحہ ۴۶ سے آگے

ہوگیا کہ رسول اللہؐ نے کچھ اور ارشاد فرمایا تھا۔ لیکن اس کا جواب تو بڑا آسان ہے۔ مودودی صاحب ماشاء اللہ خود سیّد ہیں، اس لئے یہ باتیں تو ان کے اپنے گھرانے کی ہیں۔ سیّد ابوالاعلیٰ صحیح طور پر نہ جانیں تو کیا شیخ ابوبکرؓ جانیں گے؟ اتنا ہی نہیں، بلکہ حدیث کے بارہ میں ان کا مسلک یہ بھی ہے کہ

روایات کے باب میں محدثین کا مستند ہونا یہ معنی کب رکھتا ہے کہ جن امور کا تعلق عقل، درایت اور فہم و استنباط سے ہے ان میں بھی وہ بالکل معتمد سمجھے جائیں

یعنی جب قرآن اپنے مقصد کے خلاف جائے تو کہہ دیا کہ قرآن کا صحیح مفہوم احادیث میں مل سکتا ہے اور جب احادیث اپنے مطلب کے خلاف جائیں تو کہہ دیا کہ نامعلوم رسول اللہؐ نے کیا ارشاد فرمایا اور صحابہؓ نے کیا روایت کر دیا۔ اور اگر کسی روایت کا "مستند" ہونا ثابت کر دیا تو کہہ دیا کہ ہمارا استنباط ان کی سند کو منسوخ کرتا ہے۔

قارئینِ طلوعِ اسلام کیلئے

خوشخبری

ایک عرصہ سے نایاب کتب کے

تازہ ایڈیشن — چھپ گئے ہیں!

(۱) **ختمِ نبوّت اور تحریکِ احمدیّت**

بڑا سائز (۲۰×۳۰/۸) جاذبِ نظر گرد پوش

قیمت: مجلّد -/۴۵ روپے

(۲) **قرآنی فیصلے** (حصّہ اوّل) بڑا سائز، حسین گرد پوش

جس میں سابقہ اوّل، دوم اور سوم جلدیں آگئی ہیں

قیمت: -/۹۰ روپے

(۳) **لغاتُ القرآن** جلد چہارم۔

قیمت: -/۷۵ روپے

چار جلدوں کا مکمل سیٹ۔ قیمت: -/۲۵۰ روپے

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

بقیہ: تھیاکریسی۔ از صـ۵۲

ہے۔ یہ لوگ ہر محاذ پر ہمیشہ مات کھاتے رہے۔ لیکن

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

اب ان مذہبی جماعتوں نے شریعت بل کی آڑ میں پاکستان کے اندر یلغار کر رکھی ہے۔ تاکہ اس راستے سے پاکستان میں مذہبی پیشوائیت کی بالادستی اور عمل داری قائم ہو جائے۔ لیکن یہ کام حکومت کا ہے کہ بانیٔ پاکستان قائداعظمؒ کی وصیت پر عمل کر کے پاکستان کو تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بننے دے گی۔ خدشہ ہے کہ اس وصیت کا بھی کہیں وہی حشر نہ ہو جو دوسری وصیتوں کا ہوا ہے۔ کیونکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ جو کہا گیا وہ نہیں ہوا اور جو نہیں کہا گیا وہ ہوا! مثلاً چالیس سال ہونے کو آئے ہیں پاکستان کے اندر قرآن کا وہ قانون ابھی تک نافذ نہیں ہو سکا جس کے لیے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ لیکن اگر اب بھی مذکورہ بالا وصیتوں پر عمل کر لیا جائے تو عجب نہیں کہ ہماری کوتاہیوں کا مداوا ہو سکے اور ہم ربِ جلیل کی بارگاہ میں سرخرو ہو سکیں۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے لیے سب سے پہلے مذہبی پیشوائیت کے طلسم کو توڑنا ہوگا۔

رابطہ باہمی

متعلقہ احباب طلوع اسلام نوٹ فرمالیں کہ مندرجہ ذیل بزموں نے اپنے ہاں پرویز صاحب کا درس قرآنِ کریم بذریعہ VCR شروع کیا ہے۔

اوقات اور پتہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ بزم طلوع اسلام کوپن ہیگن — ڈنمارک — زیر اہتمام نمائندہ بزم جناب محمد اسلم رانا صاحب

ADD: GL KONGEVEJ 47 3TH
1610 KØBENHAVN V.
DENMARK.
TELEPHONE: 01-238062 & 02-622786
TIME: 4 PM — EVERY LAST SATURDAY OF THE MONTH.

۲۔ بزم طلوع اسلام بہاولپور — زیر اہتمام جناب بشیر احمد صاحب سیکرٹری بزم طلوع اسلام بہاولپور

جگہ :۔ ریحان چپل سٹور — مچھلی بازار — بہاولپور

وقت :۔ ۹ بجے صبح بروز جمعۃ المبارک

کراچی

محترم پرویز صاحب کا پیغام
اراکینِ بزمہائے طلوعِ اسلام کے نام
(۲)

طلوعِ اسلام کی گیارہویں سالانہ کنونشن - ۱۱ تا ۱۳ - اکتوبر ۱۹۶۸ء گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی نغمۂ توحید کے طائرانِ چمن سے محترم پرویز صاحب نے "جہانے دیگرے" کے عنوان سے خطاب فرماتے ہوئے کہا:-

میں قرآنی تحریک کے سلسلہ میں ایک اور اہم نکتہ کو بھی سامنے لانا چاہتا ہوں، میں نے دیکھا ہے کہ جو احباب اس فکر سے خاصی دلچسپی لیتے ہیں، وہ بھی اکثر و بیشتر اسے ایک ذہنی تحریک سمجھتے ہیں۔ یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے اور بہت بڑی خود فریبی کا موجب۔ قرآن کو بے شک سمجھا ذہنی طور سے ہی جاتا ہے۔ لیکن اس کا مہبط درحقیقت انسانی قلب ہے۔ اگر قرآنِ کریم کا فکری طور پر سمجھ لینا، انسان کی سیرت و کردار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ تو اس فکری کاوش کا کچھ فائدہ نہیں۔ اگر آپ کسی نسخہ کے اجزاء کے خواص و اثرات کا پورا پورا علم رکھتے ہیں۔ لیکن اسے استعمال کر کے اپنے مرض کا ازالہ نہیں کرتے۔ تو اس نسخہ کے متعلق آپ کی یہ معلومات آپکو کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں۔ جیسا کہ میں نے اس سے پہلے بھی کئی بار عرض کیا ہے۔ میرا مقام داعی کا نہیں، ایک مبلغ کا ہے۔ اس لیے میں دوسروں کا محاسبہ نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن جو حضرات قرآنی فکر کو ذہنی عیاشی سے آگے نہیں بڑھاتے، انہیں اس خود فریبی سے ضرور نکالنا چاہتا ہوں کہ اگر اس فکر سے آپ کے کردار میں بلندی اور سیرت میں پاکیزگی پیدا نہیں ہوتی تو آپ اس کاوش میں اپنا وقت ضائع نہ کیجئے۔ آپ کا مستقبل آپ کے علم سے نہیں، اخلاق سے سنورے گا۔ یوں بھی جس کا کردار پاکیزہ نہیں۔ وہ زندگی کو کماحقہٗ سمجھ بھی نہیں سکتا۔ لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۵۶/۷۹) اس کے لیے خدائی سند موجود ہے کہ جس کے قلب و نگاہ میں پاکیزگی نہیں اسے قرآن سے کیا مس ہو سکتا ہے یہ وہ متاعِ گراں بہا ہے جس کا متلاشی اس حقیقت سے آشنا ہونا

ہے کہ

ہم دل کا دیا جلا کے لائے ۔۔۔ تب جا کے ترا سراغ پایا

اگر آپ کے "دل کا دیا" نہیں جل رہا تو آپ کے ماتھے کی آنکھوں کی بصارت آپ کو راستہ نہیں دکھا سکتی۔ اور دل کے دیئے کی لو کا مظاہرہ انسان کی سیرت و کردار سے ہوتا ہے اسی لو سے اس کی اپنی زندگی کی راہیں روشن ہوتی ہیں اور یہی دوسروں کے لیے بھی قندیلِ راہ بنتی ہے۔

محترم پرویزؒ صاحب نے اپنے خطاب میں تحریکوں کے عروج و زوال پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔

آخر میں، میں آپ کو اُس مہیب اور خطرناک لیکن (بظاہر) بڑی خوشنما اور دیدہ زیب چٹان کی نشاندھی ضروری سمجھتا ہوں، جس سے ٹکرا کر دنیا کی بڑی بڑی تحریکوں کی کشتی پاش پاش ہو جاتی ہے اور ہوگی۔ ایک داعی انقلاب ایک پیغام دیتا ہے کہ اس تحریک کا مرکزی نقطہ ہوتا ہے۔ وہ پیغام صاف، واضح اور متعین ہوتا ہے۔ جب تک وہ تحریک اس پیغام کے ساتھ وابستہ رہتی ہے، زندہ اور متحرک رہتی ہے۔ لیکن اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ وہ لوگ جنہیں دنیا سمجھتی ہے کہ وہ اس بانیٔ تحریک کے بہت قریب تھے، بہت سی باتیں اس کی طرف منسوب کر کے ان کا چرچا عام کر دیتے ہیں ..... نتیجہ اس کا یہ کہ رفتہ رفتہ، اس داعی کی طرف منسوب کردہ روایات، اصل پیغام کی جگہ لے لیتی ہیں۔ اور یوں وہ تحریک کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔

مجھے عزیزانِ من! کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں نے قرآنِ کریم کو اپنی بصیرت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی فکر پر اس تحریک کی بنیاد رکھی ہے میری یہ فکر میری تحریروں میں محفوظ ہے اور انہی تحریروں کا میں ذمہ دار ہوں۔ اگر کوئی شخص کوئی ایسی بات میری طرف منسوب کرے جو میری تحریروں میں نہیں، تو اس بات کو نہ کوئی سند حاصل ہو سکتی ہے نہ میں اس کا ذمہ دار ٹھیرایا جا سکتا ہوں، خواہ وہ شخص مجھ سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔ میں نے اس وارننگ کو اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سلسلہ ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔ اس زمرہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں۔ جو باتیں تو اپنی طرف سے کرتے ہیں، اور منسوب کر دیتے ہیں انہیں تحریک طلوع اسلام کی طرف۔ وہ دانستہ ایسا کرتے ہوں یا نادانستہ، دونوں صورتوں میں اس سے تحریک کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ تحریک کے لیے سند صرف وہ تحریریں ہیں جو اس کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، نہ کہ زبانی روایات خواہ راوی کتنے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں۔ میری درخواست ہے کہ آپ احباب اس کا بھی خاص طور پر خیال رکھیں۔

طلوعِ اسلام کی بارہویں سالانہ کنونشن ۱۷ تا ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۹ء لاہور میں منعقد ہوا۔ جس میں "شہرِ زندگی" کے عنوان سے محترم پرویزؒ صاحب نے مندوبین کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا۔

"راستہ کی ان خطرناک گھاٹیوں کی نشاندہی کرانے کے بعد، رفقائے محترم! یہ احساس میرے دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے کہ میں آپکی اُن مساعی جمیلہ کے لیے آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کروں جو آپ کی طرف سے سال بھر میں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں ظہور میں آئی ہیں۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے، ہماری تحریک سرمایہ داروں کی تحریک نہیں نہ ہی اسے کہیں سے کوئی امداد ملتی ہے۔ جو تحریک ہر غلط بات کو غلط کہہ دے، اور لگی لپٹی بغیر پکار کر کہہ دے۔ اسے اس زمانے میں امداد کہاں سے مل سکتی ہے؟ ہماری تحریک سے وابستہ حضرات اس طبقہ سے متعلق ہیں۔ جسے عرفِ عام میں متوسط (یا سفید پوشیوں کا) طبقہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اس زمانے میں دیانتدارانہ زندگی بسر کرنے والوں کی آمدنی محدودیت، اور اشیائے صرف کی ہوشربا گرانی نے اس طبقہ کو قریب قریب ختم کر دیا ہے۔ اب ملک میں عملاً دو ہی طبقے رہ گئے ہیں۔ اُوپر کا طبقہ جو اُن چند گھرانوں پر مشتمل ہے۔ جن میں دولت اُمنڈ کر آگئی ہے۔ اور نچلا طبقہ، جو کسی نہ کسی طرح۔ مرتے بھرتے زندگی کے دن گذار رہا ہے۔ ہماری تحریک سے دلچسپی رکھنے والے، اس دوسرے طبقہ سے متعلق ہیں۔ اور قرآنی شہادت کے مطابق، آسمانی انقلاب کی دعوت پر لبیک، سب سے پہلے، ہوئی بھی اسی طبقہ کی طرف سے ہے۔ لہٰذا ہمارے ذرائع لامحدود کیسے ہو سکتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ آپکا جذبۂ صادقہ اور قابلِ رشک ہمت ہے جو اس قدر حوصلہ شکن حالات میں بھی اپنا پیٹ کاٹ کر، اس قرآنی دیئے کے لیے تیل، بتی کا انتظام کر رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ احباب کے اس ایثار کی میرے دل میں بڑی قدر ہے اور میزانِ خداوندی میں اس کا بڑا وزن۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ہمتوں میں مزید برکت عطا فرمائے۔

تحریکِ طلوعِ اسلام کے درخشندہ نتائج کا تجزیہ فرماتے ہوئے محترم پرویزؒ صاحب نے کہا۔

قرآن کے پیغامِ انقلاب آور کی نشر و اشاعت کے لیے آپ کی سالہا سال کی نہایت خاموش اور (بظاہر) بڑی سست خرام جدوجہد نے کیا نتائج پیدا کئے ہیں، اس کا تصور ہم خود بمشکل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ہم، پانی کے اندر غوطہ زن ہیں۔ اس لئے اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ہم کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہیں۔ اس کی بات اُس سے پوچھیئے جو ندی کے کنارے کھڑا سب کچھ دیکھ رہا ہو۔ وہ ہمیں بتائے گا کہ جب ہم نے آج سے تیس سال پہلے یہ آواز بلند کی تھی تو تمہارے ہاں قرآن کریم کا تصور

تلاوت برائے حصول ثواب یا ایصالِ ثواب سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ لیکن آج ہر طرف سے آپ کو یہ آواز سنائی دے گی کہ قرآن کریم ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو ہر زمانے میں، اور انسانی زندگی کے ہر گوشے میں، نوع انسانی کا خضرِ راہ بن سکتا ہے۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ زمیلان محترم! کیا اتنے مختصر سے عرصہ میں، جو قوموں کی زندگی میں لمحہ بھر سے زیادہ نہیں، اس بے سروسامانی کے باوجود، ایک پورے ملک ہی میں نہیں، بیرونِ ملک تک کی فضا میں اس قدر انقلاب پیدا کر دینا، کچھ کم کامیابی ہے؟ میں تو عزیزان من! جب اس تبدیلی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو والہانہ طور پر میری کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ؎

میری نگاہ نے جھک جھک کے کر دیئے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا

اور میں تو، بکمالِ عجز و نیاز، بطور تحدیثِ نعمت، یہاں تک کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ صدر اوّل کے بعد، ہماری تاریخ کے کسی دور میں بھی، خالص فکر قرآنی کا اس قدر عالمگیر چرچا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ کیا آپ، محبان گرامی قدر! اپنی اس سعادت کو وجہ صد ناز و باعث ہزار افتخار نہیں سمجھتے کہ جب میدانِ حشر میں، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، بدرگاہِ ایزدی، یہ لرزہ انگیز شکایت کریں گے کہ۔ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰)

"اے میرے نشوونما دینے والے! یہ ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو ایک شے مہجور بنا کر رکھ چھوڑا تھا" تو آپ کا شمار اس قوم میں نہیں ہوگا جس کی طرف حضورؐ کی انگلی اٹھے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی ہزار کامرانیاں اور سرفرازیاں اس ایک استثناء پر قربان کی جا سکتی ہیں۔

لہٰذا برادران! آپ ان تمام ہنگامہ خیزیوں اور شورش انگیزیوں سے صرف نظر کر کے اپنی ان خاموش سرگرمیوں میں، اس یقینِ محکم کے ساتھ منہمک رہیں کہ اس وقت ساری دنیا میں صرف آپ کی یہ مختصر سی جماعت ہے جو پیغامِ خداوندی کی مئے بے درد و صاف کو شفاف اور بے رنگ پیمانوں میں پیش کر رہی ہے۔

طلوع اسلام کی تیرہویں سالانہ کنونشن۔ ۲۳ تا ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی اس موقع پر اراکین بزمہائے طلوع اسلام سے محترم پرویزؒ صاحب نے جو خطاب فرمایا۔ اس کا عنوان تھا "سکونِ گہربیدہ" اسلامی سوشلزم۔ اور کسی ایک فرقہ کی فقہ کے نفاذ و عمل کے مطالبات کا تجزیہ کرتے ہوئے محترم پرویزؒ صاحب نے فرمایا۔

"اگر اس تحریک، اور تحریک کے داعیان اور متبعین کے لیے، جو اپنی نسبت اسلام کی طرف کرنا چاہتے

ہیں۔ خواہ وہ اقامتِ دین کی اصطلاح سے متعارف ہوں اور خواہ اسلامی سوشلزم کے نام سے موسوم۔ کہ اپنے آپ کو اسلام سے منسوب کرنے کا حق صرف اس تحریک کو ہو سکتا ہے جس کی بنیادیں اس ایمان پر استوار ہوں جسے قرآن نے ہر عملِ صالح کی اوّلین شرط قرار دیا ہے۔ اسکے نزدیک، ایمان کی اہمیت اس قدر ہے کہ وہ اصطلاحی مسلمانوں سے بھی تقاضا کرتا ہے کہ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ ... ۴/۱۳۶

ایسے وہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوں ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر، اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے۔ مسلمانوں سے ایمان لانے کے مطالبہ سے مراد ہی یہ ہے کہ اپنا یا اپنی تحریکوں کا نام اسلامی رکھ کر اس فریب میں مبتلا نہ ہو جاؤ کہ ہم مومن ہو گئے ہیں اور ہماری تحریکیں فی الواقعہ اسلامی۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو بھی اس فریب میں مبتلا رکھے چلے جا رہے ہیں اور دوسروں کو بھی یہ فریب دیئے جا رہے ہیں کہ محض چند الفاظ کی تبدیلی سے مملکتیں اور تحریکیں اسلامی بن جاتی ہیں۔ جب پاکستان اسمبلی نے قرار داد مقاصد پاس کی تھی تو جماعت اسلامی نے اعلان کر دیا تھا کہ اب مملکت مسلمان ہو گئی ہے، اور اب وہ یہاں، کسی ایک فرقہ کی فقہ نافذ کر دینے سے یہ احساس دلا رہی ہے کہ ملک میں اسلامی نظام قائم ہو جائے گا۔ اسی طرح کچھ، دوسرے لوگ یہ سمجھا اور سمجھا رہے ہیں کہ موجودہ معاشی نظام کے ڈھانچے کی جگہ ایک دوسرے نظام کا ڈھانچہ قائم کر دینے سے، ملک میں اسلامی نظامِ معیشت رائج ہو جائے گا۔ طلوعِ اسلام نہ اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا رکھنا چاہتا ہے، اور نہ ہی ان حضرات کو جو اس تحریک سے وابستہ ہیں یا اس سے متفق، اس التباس میں مبتلا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان حضرات سے، جو ملک میں مختلف تحریکوں کے داعی ہیں یہ گذارش کرنا چاہتا ہے کہ وہ موجودہ نظامِ مملکت میں جس قسم کی میکانکی تبدیلی لانا چاہتے ہیں، اس کے لیے وہ اپنی صوابدید کے مطابق جو چاہیں کریں۔ لیکن اپنی تحریکوں کو اسلامی کہہ کر نہ پکاریں اس لیے کہ اس سے علاوہ دیگر امور، ایک بہت بڑا نقصان یہ ہو گا کہ جب ان کا نظام، ناکام رہے گا تو (جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے) دنیا یہ کہے گی کہ اسلام میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ نوعِ انسان کو کوئی محکم نظام دے سکے۔

باقی رہے وہ گرمجوش حضرات (جو بیشتر نوجوانوں کے طبقہ پر مشتمل ہیں اور) جو ان ہنگامی تحریکوں میں شامل ہو کر اپنے تند و تیز جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرنا چاہتے ہیں وہ ان

میں شوق سے شامل ہوں۔ لیکن یہ کہہ کر اپنے آپ کو یا دوسروں کو لائے فریب نہ کریں کہ وہ تحریک، اُس اسلامی نظام کے حصول کے لیے عملی اقدام ہے جس کی دعوت طلوع اسلام دیتا ہے۔ طلوع اسلام کی دعوت، جو قلب و نگاہ کی تبدیلی کی دعوت ہے، پہلے بھی ملک کی دیگر تحریکات سے الگ اور منفرد دعوت تھی، اور آج بھی اسی طرح الگ اور منفرد دعوت ہے جہاں تک بزمہائے طلوع اسلام کے ارکان کا تعلق ہے۔ دستورِ اساسی کی رُو سے، کوئی رکن کسی سیاسی پارٹی کا ممبر نہیں بن سکتا۔ اور طلوع اسلام عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتا.....

.... طلوع اسلام کی تحریک، فکری تحریک ہے۔ یہ شروع ہی سے فکری تھی۔ اور جوں جوں ہنگامی تحریکوں کے تجربات سامنے آتے جاتے ہیں، یہ حقیقت نمایاں تر ہوتی جاتی ہے کہ قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے، ہنگاموں سے نہیں۔ اس سے ہمارا یقین اور مستحکم ہو جاتا ہے کہ طلوع اسلام کی تحریک حق و صداقت پر مبنی ہے۔

طلوع اسلام کی چودھویں سالانہ کنونشن ۲۵ تا ۲۸ نومبر ۱۹۷۱ء گلبرگ لاہور ہی میں منعقد ہوئی اس موقع پر اراکین بزمہائے طلوع اسلام سے محترم پرویز صاحب نے "نالۂ بیباک" کے عنوان سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے بھی احبائے من! اپنے وقت کے مختلف تغیرات کو جو خوش آئند قرار دیا تو اسی لیے کہ میری قرآنی بصیرت میری رہنمائی اس طرف کر رہی تھی کہ زمانے کا ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھ رہا ہے جسے قرآن کریم کی منزلِ اوّلین۔ یعنی حصولِ لا۔ کا تقاضا پورا کرنے میں بڑی حد تک معاون ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اگر یہ تغیرات قرآنی نظام کی رُو سے لائے جاتے تو لا اور اِلّا۔ (تخریب و تعمیر) کا پروگرام ساتھ کے ساتھ رُوبعمل ہوتا۔ لیکن چونکہ مسلمان نے، جو اس کتابِ عظیم کے وارث ہونے کے مدعی ہیں، تغافلِ مجرمانہ برتا اور اپنے خود ساختہ اسلام کو "دینِ خداوندی" سمجھ کر كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ۔ کی عبرتناک تصویر بنے بیٹھے رہے، اس لیے "گردشِ زمانہ" نے اپنا عمل جاری رکھا اور اپنی باتِ پیہم سے ہر اس نظام کو پاش پاش کر دیا۔ جو اس کی راہ میں روڑے اٹکاتا پھرتا تھا۔ اس لیے یہ تغیرات لا کی وادی تک محدود رہے۔ میری کوشش یہ رہی ہے کہ انسانی فکر کی راہنمائی، قرآن کی متعین کردہ، منزلِ اِلّا کی طرف کیے جاؤں تاکہ یہ تخریب بلا تعمیر نہ رہ جائے۔ میں چونکہ اتوار کی صبح کے اپنے خطاب میں جس کا عنوان ہے، "اسلامی سوشلزم"، اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کروں گا۔ اس لیے اس وقت انہی ارشادات پر اکتفا کیا جاتا ہے بہرحال یہ ہے تحریکِ طلوع اسلام کا مقصود و مطلوب۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہماری اس سعی و کاوش کی مخالفت ہر رجعت پسند قوت کی طرف سے ہو گی جو دین کے راستے میں

سنگِ گراں بن کر حائل ہے، اس لیے کہ وہ قوتیں اچھی طرح جانتی ہیں۔ کہ اُنکے مجنونانہ طوفانوں کے مقابلے میں، جو راستے کی رکاوٹوں کے صرف بالائی حصے کو مسمار کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں، انکے لیے یہ فکری انقلاب زیادہ خطرناک ہے جو ان کے خود ساختہ، مفاد پرستانہ نظام کی بنیاد کو اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے چنانچہ آپ نے دیکھ لیا کہ ہمارے ہاں کی مذہب پرست جماعتیں، ہر اس پارٹی کے ساتھ مفاہمت کے لیے تیار ہو جاتی ہیں جنہیں یہ ایک وقت میں ملحد اور بے دین قرار دیتی ہیں لیکن آپ کی تحریک کی مخالفت میں کبھی کمی نہیں کرتیں ..... یہ ہماری قوم کی بدبختی اور نوع انسان کی حرماں نصیبی کہ ان اسلام دشمن عناصر نے طلوع اسلام کی قرآنی فکر کو اس قدر ہوا بنا دیا کہ اچھے اچھے مخلص اور سمجھ دار لوگ بھی اس سے متفق ہونے کے باوجود، اس کی طرف کسی قسم کی نسبت سے گھبراتے اور کترانے لگ گئے۔ یہ ہوتا ہے پروپیگنڈا کا اثر۔

ان حالات میں سوچیے! رفیقان من! کہ کس قدر خوش نصیب ہیں وہ جو اس کاروان رشد و ہدایت کے ہم سفر ہوئے اور راستے کے ہر خطرہ کا مقابلہ کرتے ہوئے، برابر ساتھ چلتے آئے۔ اور ساتھ چلے جا رہے ہیں ..... اللہ تعالیٰ آپ احباب کے حوصلوں میں برکت اور عزائم میں استقامت عطا فرمائے کہ آج سارے عالم اسلام میں پیغام قرآنی کے علمبردار آپ کے سوا کوئی نہیں۔ کتنی بڑی ہے یہ سعادت جو مبداء فیض کی گرم گستری نے آپ کو ارزاں فرمائی ہے اور آپ سے کہیں زیادہ میں آپنے آپکو خوش نصیب سمجھتا ہوں جسے آپ جیسے مخلص، مشفق، غم گسار، رفیقان سفر میسر آئے ہیں۔ خدائے کائنات کی اس موہبت کبریٰ پر جس قدر بھی سجدہ ریز ہوں کم ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و خرم رکھے اور زندگی کے ہر بلند و طیب مقصد میں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے"

طلوع اسلام کی پندرھویں سالانہ کنونشن۔ ۲۳ تا ۲۶ نومبر ۱۹۷۳ء ۲۵ بی گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی "معرکہ دین و وطن" کے عنوان سے محترم پرویز صاحب نے اراکین بزم طلوع اسلام سے خطاب فرماتے ہوئے کہا۔

"اس معرکۂ دین و وطن میں ہمارا پروگرام بھی نیا نہیں ہوگا۔ ہم نے عملی سیاسیات میں حصہ لینا ہے نہ ہنگامے برپا کرنے ہیں۔ ہمارے پیش نظر نہ کسی سے ٹکراؤ ہے، نہ الجھاؤ، ہم نے اپنے معمول و دستور کے مطابق قرآنی فکر کو نہایت امن و سکون کے ساتھ زیادہ سے زیادہ حد تک عام کرتے جانا ہے۔ انہی طریق سے ہم نے پہلے میدان مارا تھا۔ اسی سے اب ہمیں بفضل ایزدی کامیابی و کامرانی حاصل ہوگی۔ آپ اُسی روش قدیم کے مطابق، اس کی ابتداء کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اندھیرے کس طرح چھٹتے اور روشنیاں کس طرح بڑھتی ہیں ..... میں جانتا ہوں کہ ملک کی

بڑی بڑی تنظیمیں، جن کے ہاں زر و سیم کا سیلاب اُمنڈے چلا آتا ہے، ہماری اس بے سروسامانی پر ہنستی ہیں اور کہتی ہیں کہ — ذرّۂ ناچیز و بیابانے نگر — لیکن آپ ان سے پوچھیئے کہ اس بناہ ساز و سامان کے باوجود، ان کے نامہ اعمال میں سوائے تخریبات کے اور ہے کیا؟ آپ عزیزانِ من! ان مخالفوں کی باتوں پر نہ جایئے۔ آپ کا جنونِ شوق، ان کے ہزار مادی ساز و سامان سے زیادہ گراں قدر اور نتیجہ خیز ہے۔

(کہے زمانہ جو دیوانہ، کوئی بات نہیں اٹھاؤ ہاتھ میں پیمانہ، کوئی بات نہیں)

طلوع اسلام کی سولھویں سالانہ کنونشن ۲۲ تا ۲۵ نومبر ۱۹۷۳ء کو گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی۔ بزمہائے طلوع اسلام سے محترم پرویز صاحب نے "غلامی سے بتر ہے بے یقینی" کے عنوان سے خطاب فرمایا ملک میں چھائی ہوئی یاس و ناامیدی کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ، ابلیس کے معنی مایوس ہیں۔ کسی قوم کو تباہ کرنے کے لیے اس کا آخری حربہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں مایوسی کو عام کر دیا جائے..... اس وقت ہماری قوم ابلیس کے اس حربہ کا شکار ہو رہی ہے۔ دانشورانِ قوم اس ہمہ گیر مایوسی کا سبب معلوم کرنے کے لیے دکھائی دیتے ہیں، لیکن ان کی نگاہیں کسی نہ کسی ہنگامی اور قریبی حادثہ پر جا کر رُک جاتی ہیں۔ اس کے حقیقی اور بنیادی سبب تک نہیں پہنچ پاتیں۔ وہ علامات مرض کو دیکھتے ہیں۔ علت مرض ان کے سامنے نہیں آتی۔ علتِ مرض، عزیزانِ من انہی کے سامنے آسکے گی جو قرآنی روشنی میں اس کی تلاش کریں گے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے تشکیل پاکستان کے فوری بعد کہا تھا کہ ہمیں یہ مملکت، قوم کی فکری صلاحیتوں کی بنا پر نہیں ملی۔ یہ چند اتفاقی اسباب کے جمع ہونے کا نتیجہ ہے جو ملت کے رہبر فرزانہ قائداعظمؒ کے حسنِ تدبر و خلوص کی بناء پر ہمارے حق میں مرتب ہو گیا۔ یہ مملکت تو ہمیں اس طرح مل گئی۔ لیکن یہ کبھی مستحکم نہیں رہ سکتی جب تک قوم کے دل و دماغ میں صحیح فکری انقلاب پیدا نہیں ہوگا۔ یہ تنبیہ میری اپنی فکری تخلیق نہیں تھی یہ قرآن کا پیغام تھا جسے میں نے قوم تک پہنچا دیا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ یاد رکھو!

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۱۳/۱۱۔ خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کرے.....

قوم اس دور دراز راستہ پر گامزن ہونے کے لیے تیار نہ ہوئی اور ہنگامہ آرائیوں میں اُلجھ گئی۔ لیکن ہنگامہ آرائی

کا نتیجہ تخریب کے سوا کچھ نہیں..... آپ کو یاد ہوگا کہ قوم تو ایک طرف۔ خود آپکی تحریک میں عجلت سے سے شامل ہو جانے والے کئی گرم رو نوجوان یہ کہہ کر آپ سے الگ ہو گئے کہ یہ سست رفتار بے عملوں کی تحریک ہے۔ زمانہ بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے آپ جب تک قوم میں فکری اور نفسیاتی تبدیلی پیدا کریں گے..... دنیا کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی..... چنانچہ گرم جوش رہرو، بغیر فکری انقلاب، ہنگامہ آرائیوں کے راستے پر گامزن رہے اور، مستحق ہزار تبریک و تہنیت ہیں آپ احباب، کہ آپ نے اس راستے کی ہزار دلفریب جاذبیتوں کے باوجود، اپنی پُرسکون راہ کو نہ چھوڑا۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی رہی کہ ٹھک ٹھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے۔ اور آپ اسی رفتار سے آگے بڑھتے چلے گئے..... میں نے عزیزان محترم، اس پیدا ہونے والی کیفیت کی نشاندہی، آج سے تین سال پہلے، اسی مقام پر، اسی کنونشن (منعقدہ ۱۹۷۰ء میں) اپنے اس خطاب میں کر دی تھی جس کا عنوان تھا "قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں"..... یہ ہے وہ حقیقت جس کی طرف میں قوم کو دعوت دیئے چلا آ رہا ہوں اور جس کی وجہ سے میں مذہب پرست طبقہ کی طرف سے مطعون قرار دیا جا رہا ہوں لیکن جس حقیقت کو میری نگہ بصیرت نے بے نقاب دیکھ لیا ہے میں ان کی مخالفت کی وجہ سے..... اسے کس طرح چھوڑ سکتا ہوں۔ اور یہی ہے برادرانِ من! تحریک طلوع اسلام کا مقصد و منتہیٰ..... میں جانتا ہوں کہ ہماری تحریک ان ارباب ہمت پر مشتمل ہے جن کے وسائل نہایت محدود ہیں۔ ہمیں کسی گوشے سے کسی قسم کی کوئی امداد حاصل ہونے ہی اس کی توقع کی جا سکتی ہے کیونکہ قرآنی انقلاب، ہر نوع کے مفاد پرستیوں اور طالع کے لیے پیامِ مرگ ہے اس لئے اس تحریک کی امداد کون کرے گا؟ مجھے اس کا بھی ہے کہ آپ احباب اس میں پہلے ہی اپنی بساط سے کہیں بڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ لیکن جود میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس سے بھی زیادہ ہمت سے کام لیں اور تمام کے عام کرنے میں زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔

کی سترھویں سالانہ کنونشن ۲۴ تا ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۴ء ۲۵ بی گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی جس صاحب کے استقبالیہ کا عنوان تھا "میری دعا ہے تیری آرزو بدل جائے" بزمہائے طلوع اسلام کین سے خطاب فرماتے ہوئے موصوف نے فرمایا۔

"آخر میں میرا روئے سخن پھر اپنے قرآنی احباب کی طرف ہے۔ ہم نے عزیزانِ من! اس آواز کو اس تمانے میں اٹھایا جب ہمنوائی تو ایک طرف اس کی صدائے بازگشت بھی کہیں سے سنائی نہیں

دیتی تھی۔ اس کے برعکس اس کی مخالفت اس شدت سے ہوئی کہ اس کا بڑھنا یا اثر انداز ہونا تو ایک طرف اس کے زندہ رہنے کے بھی بظاہر کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ ہمارے بعض ہم سفر اس کی نتیجہ خیزی کی طرف سے مایوس ہو کر الگ ہو گئے۔ بعض اس کی سست رفتاری کی وجہ سے تھک کر بیٹھ گئے۔ بعض شارٹ کٹس (پگ ڈنڈیوں) کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکل گئے لیکن میں آپ احباب کی ہمت کی داد دیتا ہوں۔ کہ مخالفتوں کے اس تمام ہجوم اور نامساعد حالات کے اژدہام کے باوجود آپ کے پائے استقامت میں ذرا سی بھی لغزش نہ آئی۔ اور آپ اس ننھے سے دیئے کو چراغ راہ بنائے ہوئے مسلسل آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہ سب اس یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا نتیجہ ہے کہ دُھند چھٹ رہی ہے تاریکیاں کافور ہو رہی ہیں اور نشانات منزل اُبھر اور دکھائی دینے لگ گئے ہیں۔

آپ ذرا اس واقعہ پر غور کیجئے کہ ۱۹۳۵ء میں بہاولپور کی ایک ریاست نے میرے مقالہ پر مبنی یہ فیصلہ دیا تھا کہ مرزا غلام احمد کو نبی ماننے والے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ میں نے اپنی اس آواز کو غیر منقسم ہندوستان میں بھی جاری رکھا اور تشکیل پاکستان کے بعد بھی اسے دُہراتا چلا گیا کہ یہ حکومت کا فریضہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کا فرق متعین کرے اور ختم نبوت کو ان دونوں میں حد فاصل قرار دے۔ آج چالیس سال کے بعد اس مطالبہ کو حکومت کی طرف سے تسلیم کیا گیا چالیس سال کا عرصہ تھوڑا عرصہ نہیں ہوتا۔ یہ تو انسان کی طبیعی زندگی کا نصف سے بھی زیادہ حصہ ہوتا ہے۔ میری نصف زندگی اس میں صرف ہو گی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر میری ساری زندگی بھی اس میں صرف ہو جاتی اور آخری سانس میں بھی یہ نشیدِ جانفزا میرے کان میں پڑ جاتی تو میں شاداں و فرحاں، یہ کہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوتا کہ۔ شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم۔ تحفظِ ناموسِ رسالتؐ میرے ایمان کا تقاضا، میرے عشق کا مطالبہ، اور میری زندگی کا منتہیٰ ہے۔ اس میں میری کامیابی کچھ کم نہیں۔ لیکن یہ تنہا میری کامیابی نہیں۔ آپ تمام احباب کی کامیابی ہے۔ اگر مجھے آپ کی رفاقت میسر نہ آتی تو میں تنہا اس طول طویل راستے کو بمشکل طے کر سکتا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذَالِکَ۔ اور جب میں دیکھتا ہوں کہ اس دور میں جب کسی تحریک کی کامیابی کے لیے بڑے بڑے وسیع پیمانے پر اسباب و ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے ہمیں یہ کامیابیاں اس بے سروسامانی کی حالت میں نصیب ہو رہی ہے، تو میرا سرِ نیاز بارگاہِ مسبب الاسباب میں اور بھی زیادہ خشوع و خضوع سے جھک جاتا ہے۔

طلوع اسلام کی اٹھارھویں سالانہ کنونشن ۲۳ تا ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۵ء ۲۵ بی گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی اس کنونشن میں محترم پرویز صاحب کے استقبالیہ کا عنوان تھا "خذ را ے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں" حق و باطل کی طویل کشمکش کا جائزہ لیتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے اراکین بزم ہائے طلوع اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اب میرا روئے سخن، بالخصوص کاروانِ قرآنی کے اپنے ہمسفر رفقاء کی طرف ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ آپ کس قدر عظیم فریضہ کو لے کر اٹھے ہیں۔ آپ قابل صد مبارک باد ہیں کہ آپ کسی ستائش کی تمنا اور صلہ کی اُمید کے بغیر، اور اس کے برعکس، ہر قسم کے طعن و تشنیع اور جھوٹے الزامات کے تیر و تشتر کے ہدف بننے کے باوجود گذشتہ بیس پچیس سال سے اس فریضہ کی ادائیگی میں اپنی بساط کے مطابق سرگرم عمل ہیں۔ اس سلسلہ میں، میں اس تنبیہ کو دہرا دینا ضروری سمجھتا ہوں، جو اس سے پہلے بھی متعدد بار آپ کے گوش گذار کر چکا ہوں اور وہ یہ کہ آپ کے قول اور عمل سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہونے پائے جو اُمت میں تفرقہ کا موجب ہو۔ تفرقہ انگیزی قرآن کریم کی نصِ صریح کے مطابق شرک ہے ..... تفرقہ ایسا عظیم جرم ہے جس کے نتائج نسلوں تک متعدی چلے جاتے ہیں۔ یہ وجہ ہے جو میں شروع شروع سے یہ تاکید کرتا چلا آرہا ہوں کہ آپ اس فکر کو عام کیجئے۔ لیکن کوئی فرقہ یا پارٹی یا جداگانہ جماعت بنائے بغیر۔ آپ کی بزموں کی حیثیت بھی ایک تنظیمی کوشش سے زیادہ کچھ نہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ آپ جس قرآنی فکر کو عام کرتے ہیں، اس کی تردید میں کسی کو ایک لفظ بھی زبان پر لانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اس لیے کہ وہ مبنی بر سند و حجت ہوتی ہے۔

ایک اور ضروری بات بھی آپ احباب کے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں۔ قرآنِ کریم میں متعدد احکام و ہدایات ایسے ہیں جنہیں ہم انفرادی طور پر بجا لا سکتے ہیں اور ان کی بجا آوری ہماری سیرت و کردار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ لیکن بعض احباب کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ اس پر عمل اس وقت ہو سکتا ہے، جب اسلامی نظام قائم ہو۔ ایسا کہنا اگر فریب دہی نہیں، تو خود فریبی ضرور ہے۔ اس میں شُبہ نہیں کہ ایسے مہمات امور بھی ہیں۔ جن کی سرانجام دہی اسلامی نظام ہی میں ممکن ہے لیکن جن امور پر موجودہ حالات میں بھی انفرادی طور پر عمل ہو سکتا ہے، ان پر عمل پیرا نہ ہونا۔ ہمارے کردار کی خامی اور سیرت کی ناپختگی ہے، میں ان میں سے چند ایک قرآنی ہدایات کی نشاندھی کرتا ہوں۔ آپ انہیں دیکھئے اور سوچیئے کہ ان پر بحالتِ موجودہ

عمل پیرا کیوں نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً قرآنِ کریم میں ہے (۱) اپنے وعدوں کو کرو (۲) معاہدوں کی پابندی کرو۔ (۳) بات غیر مبہم، صاف، واضح اور دوٹوک کرو (۴) ایسی باتیں کرو جو حُسن کا پہلو لیے ہوں (۵) دوسروں کی عیب جوئی کے لیے ان کی ٹوہ میں نہ رہا کرو۔ (۶) لوگوں سے ترش روئی سے پیش نہ آؤ۔ (۷) ان کے بُرے بُرے نام نہ رکھو (۸) غیبت نہ کرو (۹) یونہی اکڑتے نہ پھرو۔ (۱۰) افواہوں پر یقین نہ کر لیا کرو۔ ان کی خود تحقیق کر لیا کرو۔ (۱۱) لغویات سے پرہیز کرو۔ (۱۲) راستہ چلتے ہوئے اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیا کرو۔ اور ہر قسم کی بے حیائی اور فحاشی سے بچو (۱۳) بدظنی سے پرہیز کرو (۱۴) یونہی غصہ میں مُشتعل نہ ہو جایا کرو (۱۵) جو لوگ تمہارے دین کا مذاق اڑائیں ان سے کنارہ کشی اختیار کرو (۱۶) بوڑھے والدین سے حُسنِ سلوک سے پیش آؤ (۱۷) گھر کی زندگی کو خوشگوار رکھو (۱۸) جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں ان کی عزت اور دل جوئی کرو (۱۹) اگر تم کسی محتاج کی حاجت روائی کرنے کے قابل نہ ہو تو اس سے کم از کم نرم خوئی کا برتاؤ کرو (۲۰) غور و فکر کی عادت ڈالو۔

میں نے قرآن کریم کی اخلاقی ہدایات میں سے یہ چند ایک مثال کے طور پر پیش کی ہیں آپ فرمائیے کہ ان میں سے کون سی بات ہے جس پر بحالتِ موجودہ انفرادی طور پر عمل نہیں کیا جا سکتا؟ آپ سے میری التماس ہے کہ آپ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی کردار کا بھی خیال رکھیں اور حق تو یہ ہے کہ فکر ہی پیش کش بھی اُسی کی موثر ہو سکتی ہے۔ جس کا کردار قابلِ اعتماد ہو۔ جو بھرے مجمع میں کہہ سکے کہ میں نے تم میں اپنی عمر گذاری ہے تم اس سے اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ میرے عزیز رفیقو! زندگی کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو معمولی نہ سمجھو۔ کیریکٹر کی تو پہچان ہی روزمرہ زندگی میں اس قسم کے چھوٹے چھوٹے اُمور سے ہوتی ہے۔

محترم پرویز صاحب نے کہا

واضح رہے کہ میں نہ کسی جماعت کا امیر ہوں، نہ کسی فرقہ کا امام ہوں، نہ کسی سلسلہ تصوف کا مقتدا۔ جو آپ احباب سے حُکماً کچھ کرا سکوں۔ یا آپ کا مواخذہ کر سکوں۔ میں تو آپ ہی میں سے ایک ہوں اور جو کچھ آپ سے کہتا ہوں۔ وہ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ کی ذیل میں آتا ہے۔ یعنی رفقائے کار کا ایک دوسرے کو حق اور استقامت کی تلقین کرتے رہنا اس توصیہ کے بعد میں آپ سے گذارش کروں گا کہ آپ دنیا کے طعن و تشنیع اور جھوٹی الزام تراشیوں

اور بہتان بازیوں کی پروا کئے بغیر، اپنے خود عائد کردہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سرگرم عمل رہیئے۔

طلوعِ اسلام کی انیسویں سالانہ کنونشن - ۲۱ تا ۲۳ اکتوبر - ۲۵ بی گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی اس موقع پر محترم پرویز صاحب کے استقبالیہ خطاب کا موضوع تھا "آدم نو کی تخلیق"، ۱۹۷۶ء کے بعد ملک کے حالات نامساعد رہے اس لیے طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن منعقد نہ ہو سکے۔ یوں سمجھئے کہ اراکینِ بزم ہائے طلوعِ اسلام سے محترم پرویز صاحب کا یہ آخری خطاب تھا اس لیے خصوصی طور پر ہم سب کے لیے توجہ کا مستحق ہے تحریک طلوعِ اسلام کا مقصد بیان فرماتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے کہا۔

"تحریک طلوعِ اسلام کا مقصد، عزیزانِ من! اسی قسم کے منتشر افراد کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے۔ وہ افراد جنہیں یہ یقین محکم حاصل ہو کہ انسانی مشکلات کا حل، قرآنِ مجید کے سوا کہیں نہیں مل سکتا اب میرا روئے سخن بالخصوص ان احباب کی طرف ہے جو اس مقصد کو دل میں لیے اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہو چکے ہیں، اور اس غرض کے لیے اس اجتماع میں شریک ہوتے ہیں کہ اس تحریک کے فروغ اور اس مقصد کے حصول کے لیے کیا کچھ مزید کیا جائے۔ یہ جذبہ بڑا مبارک اور اس قسم کی کوشش بڑی مستحسن ہیں۔ لیکن میں اس سلسلہ میں ایک وارننگ نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ قرآن کریم محض فکری وحدت کو کافی قرار دے نہیں سکتا۔ اس کے نزدیک حقیقی وحدت وہ ہے جو قلوب کی ہم آہنگی سے پیدا ہو۔ جو شخص فطری طور پر اس مقصد کو صحیح سمجھ کر اپنے آپ کو اس رشتہ میں منسلک کرے گا وہ اس گروپ میں شامل ہو جائے گا۔ لیکن صرف اتنے سے وہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ جسے قرآن اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ (۳/۱۰۳) سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی دلوں کا آپس میں جڑ جانا۔

اور ایسا ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ کی فکر، آپ کے احساسات و جذبات کو متاثر اور متحرک نہ کرے۔ یاد رکھیئے! تنہا فکر، عمل کی محرک نہیں ہو سکتی۔ عمل کے محرک، جذبات و احساسات ہوتے ہیں۔ جب مختلف افراد کے جذبات، ایک جیسی فکر سے متاثر ہوں گے تو ان کے وحدتِ کردار و عمل پیدا ہوگی۔ اسی لیے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ـــــ وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام ـــــ اس قرآنی حقیقت کی اہمیت کو اب مغربی مفکرین بھی سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ اس سے پہلے ان کا سارا زور فکری ہم آہنگی پر ہوتا تھا۔ عصرِ حاضر کے مشہور مؤرخ تہذیب (J.H.DENISON) نے ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے ـــــ (EMOTION AS THE BASIS OF

وحدتِ قلبی

(CIVILISATION) ـــــ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ علامہ اقبال جیسے عظیم مفکر نے اپنے چھٹے خطبہ کے شروع میں اس کتاب کا ایک طویل اقتباس دیا ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں (GEORGE FOOT MOORE) لکھتا ہے۔

تہذیب کا نشوونما اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کسی مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کرے۔ اس قسم کا اتحاد، تنہا وحدتِ فکر کی بنا پر ممکن نہیں ہوتا یہ اتحاد وحدتِ جذبات و احساسات سے ممکن ہوتا ہے جن سے انسانی فکر میں جذباتی تحرک پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ معتقدات اور مقاصد بن جاتے ہیں۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ ہم میں (یعنی جنہوں نے اس تحریک سے وابستگی اختیار کی ہے ان میں) قدرِ مشترک یا وجہ پیوستگی فکری وحدت ہے، اور ہماری غلط نگہی یہ کہ ہم نے اس کو کافی سمجھ لیا ہے۔ ہم میں جذبات و احساسات کی وحدت پیدا نہیں ہوئی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم میں بھی (دوسرے لوگوں کی طرح) اکثر باہمی نزاعات اُبھرتی رہتی ہیں، حالانکہ جذباتی وحدتِ میں کسی قسم کی نزاع کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ یہ جو قرآن کریم نے مومنین کی یہ خصوصیت بیان کی ہے کہ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۹/۷۱) وہ ایک دوسرے کے جگری دوست ہوتے ہیں، تو اس قسم کے تعلقات جذباتی وحدت کے بغیر ممکن نہیں۔ محض فکری وحدت آپ میں، گھڑی کے پرزوں کی طرح، میکانکی تعاون تو پیدا ہو جائے گا۔ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ کی کیفیت پیدا نہیں ہوگی۔ گھڑی کے پرزے ساری عمر محوِ گردش رہتے ہیں لیکن رہتے ہیں ویسے کے ویسے ہی بلکہ وہ گھس گھسا کر ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا ارتقاء پیدا نہیں ہوتا فکری وحدت زیادہ سے زیادہ اسی قسم کے نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ انسان کی داخلی دنیا میں تغیر پیدا نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ فکری اشتراک کے باوجود باہمی نزاعات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ باہمی نزاع کی وجہ کیا ہوتی ہے، اسکے متعلق مشہور روسی مفکر، اوسپنسکی لکھتا ہے کہ:۔

انسانوں کو ایک دوسرے کے سمجھنے میں غلط فہمیاں اس لیے پیدا ہو جاتی ہیں کہ وہ مختلف جذبات کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر ان کے جذبات میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو وہ ایک دوسرے کو بالکل صحیح طور پر سمجھنے لگ جائیں (TERTIUM ORGANUM. P.200)

نظریاتی وحدت

وہ اپنے اس نظریہ کی تائید میں کہتا ہے کہ آپ دیکھئے۔ شراب پینے والے ایک دوسرے کے یار ہوتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ شراب ان میں ایک جیسے جذبات پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح بھنگ پینے والے ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں کیونکہ برگِ حشیش ان

سب کو ایک ہی قسم کے افلاک کی سیر کراتی ہے۔ لیکن شراب یا بھنگ کے نشے، ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں اور دوسرے ان میں، انسانی فکر معطل اور مسلوب ہو جاتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ جب اُن کا نشہ اتر جاتا ہے تو وہ پھر حسبِ سابق ایک دوسرے کے دشمن یا مخالف ہو جاتے ہیں لیکن قرآن کریم، جن جذبات کو وحدتِ فکر کی بنا پر ہم آہنگ کرتا ہے، ان میں یہ نقص نہیں ہوتا ——— نہ وہ عارضی ہوتے ہیں، اور نہ ہی ان میں فکر مسلوب یا معطل ہوتی ہے۔ بلکہ وہ فکر کو اور جلا دیتے ہیں۔ جن خوش بخت افراد میں اس قسم کی فکری اور جذباتی وحدت پیدا ہو جاتی ہے، قرآن مجید، ان کی زندگی کو جنتی زندگی سے تعبیر کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اُس جنتی معاشرہ میں داخل ہونے والوں کی اوّلین خصوصیت یہ ہوگی کہ: وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ۔ (۷/۴۳) ان کے دلوں سے غِل نکال دیا جائے گا۔ یہ لفظ (غِلّ) ہے تو بہت چھوٹا سا لیکن معانی اور مفہوم کے اعتبار سے یہ بہت وسیع ہے۔ بات سمجھنے کے لیے یوں کہئے کہ ہمارے ہاں اکثر کہا جاتا ہے کہ اس کے دل میں میرے خلاف گرہ بیٹھ گئی ہے جو نکلنے میں ہی نہیں آتی غِل کے بنیادی معنی اسی قسم کی گرہ سمجھ لیجئے۔ اور اس گرہ سے ایک دوسرے کے خلاف، کینہ، کدورت، حسد، انتقام، عداوت کی جو زہر آلود خباثتیں پیدا ہوتی ہیں، ان سب کو اس میں شامل کر لیجئے۔ یہ ہے مفہوم غِل سے۔

جنتی زندگی

جنتی معاشرہ کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل ہونے والے افراد کے دلوں میں کوئی غِل نہیں ہوگا۔ اسے جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہی دور کر دیا جائے گا۔ یہ گرہیں کھول دی جائیں گی ——— اسی کیفیت کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ۔ (۱۵/۴۷) اس کا عام ترجمہ تو یہی ہے کہ وہ تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بھائیوں کی طرح بیٹھیں گے۔" لیکن لفظ سُرُرٍ کا مادہ (س۔ر۔ر) ہے جس کے بنیادی معنی راز کے ہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے (FACE TO FACE) وہی بیٹھ سکتے ہیں جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کوئی راز کی بات نہ ہو۔ يُلْقَوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا۔ (۲۵/۷۵) وہ جب ایک دوسرے کو ملیں گے تو زندگی بخش سلامتی کی آرزوؤں کے ساتھ ایک دوسرے کو خوش آمدید کہیں گے یہ وہ جنتی معاشرہ ہوگا جو قرآنی رفقاء پر مشتمل ہے۔ اس کے برعکس، جہنمی معاشرہ میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: لَا مَرْحَبًا بِهِمْ (۳۸/۵۹) وہ منافقت اور ریاکاری سے ایک دوسرے سے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں لیکن دل سے خوش آمدید نہیں کہتے۔ وہ ایک دوسرے سے مل کر کبھی خوش نہیں ہوتے اس لیے کہ ان کے دلوں میں غِل بھرا ہوتا ہے۔

اس غِلّ کے نکالنے میں عزیزانِ من! ایک اور بھی عمیق نکتہ مضمر ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، غِلّ کے معنی ہیں دل میں پڑی ہوئی گرہ اور انتزاع کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اکھیڑ کر یا کھینچ کر نکالنا۔ جیسے پھانس نکال دی جائے۔ دورِ حاضر کے جہنمی معاشرہ میں اعصابی بیماریاں عام ہیں۔ ان سے جو اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ہمارا شب و روز کا تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ ان کیفیات کو جسمانی امراض قرار دے کر ان کے بیسیوں علاج سوچے گئے لیکن ان میں سے کوئی بھی کارگر ثابت نہ ہوا۔ اب ماہرین علم النفس (PSYCHOLOGIST) اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ جسمانی امراض ہیں ہی نہیں انسان کے تحت الشعور میں کوئی ایسا راز پیوست ہو جاتا ہے۔ جسے اس کا شعور فراموش کر چکا ہوتا ہے۔ گہرائی میں جا چھپا ہوا یہ راز، پھانس کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔۔۔ پھانس یوں تو کچھ بھی نہیں ہوتی لیکن اس کی پیدا کردہ بے چینی اس قدر شدید ہوتی ہے کہ انسان کو لمحہ بھر کے لیے چین نہیں لینے دیتی اب ان، تحت الشعور میں پیوست پھانسوں کا علاج، تجزیہ نفس کی رو سے کیا جاتا ہے۔ اس فن کا ماہر کرتا یہ ہے کہ مریض کے تحت الشعور میں چھپے ہوئے راز کو کسی نہ کسی طرح کھینچ کر باہر لے آتا ہے۔ اور مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ (بالخصوص امریکہ) میں اب یہ طریق علاج زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ اعصابی مریض ہیں بھی زیادہ وہیں۔ ایسا کس کس طریق سے کیا جاتا ہے، میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن ان سب میں ایک قدرِ مشترک ہوتی ہے اور وہ یہ کہ مریض کا اپنے علاج پر کُل اعتماد ہونا چاہیے۔ یہی اعتماد ہے جس کی بنا پر، یہ معالج اس پھانس کو باہر نکال لیتا ہے۔

اس کے بعد پھر آیئے قرآنِ کریم کی اس آیۂ جلیلہ کی طرف جس میں کہا گیا ہے کہ:۔ وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ۔ (۷/۴۳) ان کے تحت الشعور میں پیوست پھانسوں کو نکال باہر کیا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جنتی معا[شرہ] کے افراد میں باہمی اعتماد کی کیفیت یہ ہو گی کہ شعوری راز تو ایک طرف، تحت الشعور میں جا گزیں سِرِّ مستور بھی ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں ہوں گے۔ یہ کیفیت ہو گی ان کے شرحِ صدر کی۔

عزیزانِ من! اگر آپ کے باہمی تعلقات کی کیفیت ایسی ہے۔ تو پھر سمجھ لیجیے کہ تعلقات قرآنی رابطہ سے استوار ہیں۔ اگر ایسی کیفیت نہیں تو آپ کا رابطہ باہمی محض فکری اور میکانکی ہے۔ اس سے میکانکی نتائج تو مرتب ہو سکتے ہیں۔ قلب و نظر میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔

آپ ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ آپ جو قرآنی رابطہ کی بنا پر ایک گروپ بننے کے مدعی ہیں، آپ کا کس زمرے میں آتا ہے؟ ۔۔۔ قلبی یا محض میکانکی؟

مجھے اس کا علم و احساس ہے کہ آپ احباب جو فکری طور پر اس تنظیم سے وابستہ ہوئے ہیں تو آپ نے تقلیداً ایسا نہیں کیا۔ آپ نے پورے غور و خوض کے بعد اپنی سابقہ (غلط) روشوں کو چھوڑ کر علی وجہ البصیرت اس راستے کو اختیار کیا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ آپ کا ہر قدم یہ آواز دیتا ہے کہ: ؎

حرم کو چھوڑ کے پیرِ حرم کہاں جاؤں — کہ میں تو دیر و کلیسا سے ہو کے آیا ہوں

اس کے باوجود یہ نہایت ضروری ہے کہ آپ اس فکری رابطے سے مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں۔ یہ بھی دیکھیں کہ آپ کی سیرت و کردار میں وہ تبدیلی پیدا ہوئی ہے یا نہیں جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اگر آپ کے قلوب ایک دوسرے سے جڑ گئے ہیں تو پھر سمجھئے کہ قرآنی رابطہ کا مقصد پورا ہوا ہے، ورنہ نہیں ــــــ لیکن اس کے بعد بھی آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ آپ باقی مسلمانوں سے الگ کوئی ممتاز افراد بن گئے ہیں۔ یاد رکھئے اپنے آپ کو "حقیقی" اور دوسروں کو "پیدائشی" مسلمان سمجھنا۔ یا اپنے آپ کو صالح اور باقی مسلمانوں کو غیر صالح قرار دینا، انسانیت کے نفسیاتی مرض کا مظہر ہے جو احساس کمتری سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ: فَلَا تُزَكُّوٓا اَنفُسَكُمْ ۖ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى۔ (۵۳/۳۲) اپنے آپ کو یونہی مزکی نہ سمجھ لیا کرو۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اپنے آپ کو پستیوں میں گرنے سے محفوظ رکھتا ہے"۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ایغو کے اس قسم کے وساوس سے محفوظ رکھے۔ آپؐ کی سیرت و کردار کو ایسا ہونا چاہیئے۔ جس سے دنیا خود اندازہ لگا سکے کہ آپ کیسے ہیں۔

فرقہ بندی نہیں

آپ کی اس تحریک کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ بغیر فرقہ بنائے دین کی طرف دعوت دیتی ہے یہ انداز سرسید (علیہ الرحمتہ) نے اختیار کیا تھا۔ انہوں نے بھی فرقہ بندی کو خلافِ اسلام قرار دے کر اپنا کوئی فرقہ نہیں بنایا تھا۔ لیکن فرقہ پرست اسے کیسے برداشت کر سکتے تھے! وہ جو مشہور ہے کہ کسی نے کبڑی سے پوچھا کہ تمہارا کب دور ہو جائے یا سب کبڑے ہو جائیں، تو اس نے کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ سب کبڑے ہو جائیں۔ یہی حالت ہمارے فرقہ پرستوں کی ہے۔ سرسیدؒ نے ہزار چاہا کہ ان کبڑوں کا کب ٹھیک ہو جائے لیکن انہوں نے نہ مانا، اور اُسے بھی کبڑا بنا کر چھوڑا۔ سرسیدؒ نے قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کے مطالعہ اور مشاہدہ پر زور دیا تھا۔ انہوں نے اسے "نیچری" کہنا شروع کر دیا۔ اور اس سے نیچریوں کا ایک فرقہ بنا دیا۔ اور خوش ہو گئے کہ ہم نے انہیں بھی اپنے جیسا بنا دیا ہے۔ ان لوگوں نے یہی ٹیکنیک آپ کو تحریک کے سلسلہ میں بھی اختیار کی ہے۔ ہمارے ہاں فرقوں کی باہمی سر پھٹول صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔ ایک روایت کا حوالہ

دے کر (جس میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ بنی اسرائیل میں بہتّر فرقے تھے۔ میری اُمت میں تہتّر فرقے ہوں گے جن میں سے ایک فرقہ ناجی کا ہو گا۔ باقی سب جہنمی) ہر ایک فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور دوسرے فرقوں کو جہنمی ثابت کرنے کے لیے جہاد میں مصروف رہتا تھا۔ طلوع اسلام نے پہلی بار یہ آواز بلند کی کہ قرآن کریم کی رُو سے خود فرقہ سازی شرک ہے۔ اس میں، اس فرقے یا اُس فرقے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس نے ایسا قرآن مجید کی نصوصِ صریحہ کی سند کے ساتھ کیا۔ (دیکھئے ۳۰/۳۱-۳۲) اس کا جواب ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ انہیں بھی ایک فرقہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے عالمِ خیال میں ایک فرقے کا وجود تخلیق کیا اور اسے پرویزی فرقہ کے نام سے مشہور کر دیا۔ اس فرقے کا وجود خارج میں کہیں نہیں۔ صرف ان کے ذہنوں میں محبوس ہے اور ان کے جھوٹے پروپیگنڈا کی رُو سے مشہور۔ جو لوگ تحریک طلوع اسلام کی قرآنی فکر سے متاثر یا اس سے وابستہ ہیں، ان کی نہ کوئی الگ مسجد ہے۔ نہ وہ دوسروں سے مختلف کوئی اپنی نماز پڑھتے ہیں۔ نہ ان کے پرسنل لاز علیحدہ ہیں۔ وہ ان تمام امور میں اُمت کے ساتھ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، ہر محراب و منبر سے "پرویزی فرقہ" کا چرچا کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے بانی مودودی صاحب نے جو یہ ارشاد فرما دیا کہ زندگی کی بعض ضرورتوں کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں بلکہ شرعاً واجب ہو جاتا ہے، تو اس نے "خدا پرستوں" کے لیے کذب و افترا کے سب دروازے چوپٹ کھول دیئے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب، اپنے مخالف کے خلاف "خدا اور رسولؐ" کے نام پر، ہر قسم کے جھوٹے الزامات تراشے جاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اس کذب بافی پر کسی قسم کی ندامت ہو، اس پر فخر کیا جاتا ہے۔ لیکن عزیزانِ من! اس سے ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ اس دنیا میں یہ خدائی فوجدار، دوسروں کے کفر و ایمان کا فیصلہ کرنے کے لیے لاکھ مسندِ عدالت پر اپنے آپ کو فائز سمجھ لیں۔ عدالت خداوندی میں تو یہ سب، دوسروں کے ساتھ ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے۔ وہاں اگر اس "خطاکار" سے سوال ہو گا کہ تم "حسبنا کتاب اللہ" کہتے تھے تو بصد احترام عرض کروں گا کہ ہاں حضور! کہتا تھا اور عمر بھر کہتا رہا!

وفا خطا تھی، خطا میں نے زندگی بھر کی　　اب اس کے آگے جو مرضی ہو بندہ پرور کی!

لیکن آپ یہ دیکھئے، رفیقانِ گرامی قدر! کہ ان لوگوں کی طرف سے اس قدر بے پناہ مخالفت، اور آپ کی اس قدر بے سروسامانی کے باوجود، آپ کے مشن کو کامیابی کس قدر ہوئی ہے؟ آپ، تیس سال پہلے کی مذہبی کتابوں کو اٹھا کر دیکھیے۔ اور، جن احباب کی عمر زیادہ ہے، وہ اُس زمانے کے وعظوں اور

خطبوں کی یاد تازہ کریں۔ آپ کو ان میں، اور تو سب کچھ ملے گا، لیکن قرآن کا نام کہیں نظر نہیں آئے گا۔ لیکن آج کیفیت یہ ہے کہ نہ کوئی مذہبی رسالہ ایسا ملے گا نہ کوئی کتاب جس میں قرآن مجید کا نام نہ لیا گیا ہو۔ نہ کوئی محراب منبر ایسا ہوگا جہاں اپنی بات کے ساتھ قرآن کی آیت نہ ضم کی جاتی ہو، اور نہ ہی کوئی اسٹیج جہاں اپنے دعوے کی نسبت اس کتاب کی طرف نہ کی جاتی ہو۔ خواہ وہ نسبت یا دلیل غلط ہی کیوں نہ ہو۔ حتیٰ کہ اب تو دبستان حکومت اور ایواناتِ پارلیمان تک میں اس کے تذکرے سنائی دینے لگے ہیں۔ سوچیے کہ اتنی بڑی تبدیلی کس کی ناگواری کا صدقہ ہے۔ آپ بے نواؤں کی والہانہ کاوشوں کا اس تبدیلی کی اس سے بھی زیادہ دلچسپ مثال ملاحظہ کیجئے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، ہمارے ہاں ہزار برس سے مذہبی فرقے چلے آ رہے تھے۔ طلوع اسلام نے جو نصوصِ قرآنی کی رُو سے بتایا کہ فرقہ بندی شرک ہے تو اس کا کوئی جواب ان سے بن نہ پڑا۔ لیکن آپ کی اس بیباکانہ حق گوئی کا اثر یہ ہوا کہ یہ حضرات اپنے آپ کو فرقہ کہنے سے شرمانے لگے چنانچہ اب ان کی طرف سے یہ آواز بلند ہونی شروع ہوگئی ہے کہ یہ فرقے نہیں، مکاتبِ فکر ہیں۔ ہر چند ان کی یہ خود فریبی یا فریب دہی، کھسیانی بلی کے کھمبا نوچنے کے مترادف ہے، لیکن اس سے اتنا تو واضح ہے کہ آپ کی اس پکار سے یہ اپنے آپ کو فرقہ کہنے سے چھپنے لگے ہیں۔ یہ ہیں آپ کی دعوت الی القرآن کے وہ نتائج جو غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ آپ کے دیا بالفاظِ صحیح یوں کہیے کہ آپ کی قرآنی آواز کے) خلاف پھیلائی ہوئی تاریکیاں بظاہر بڑی دبیز اور وحشت انگیز نظر آتی ہیں۔ لیکن آپ کو ان کا کوئی اثر نہیں لینا چاہیئے۔ جھوٹ کے تو پاؤں ہوتے ہی نہیں۔ اس لیئے کہ

ظلمتِ شام سے اندازہ انجام نہ کر! رات کی رات میں انجام بدل سکتا ہے

اس کے بعد دو ایک ضروری تنبیہات۔ میں نے آپ سے ایک بار کہا تھا کہ آپ کی صفوں میں ایسے لوگ گھستے چلے جا رہے ہیں جو قرآن کے نام سے خلافِ قرآن خیالات پھیلاتے رہتے اور انہیں منسوب آپ کی طرف کرتے رہتے ہیں۔ میں نے متنبہ کیا تھا کہ آپ احباب ان سے خاص طور پر محتاط رہیں اور انہیں اپنے قریب نہ آنے دیں۔ اب انہوں نے ایک اور انداز اختیار کیا ہے۔ مجھے اکثر ایسے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں، جن میں لکھا ہوتا ہے کہ میں ایک عرصہ سے طلوع اسلام ترجمان القرآن یا بلاغ القرآن وغیرہ رسائل کا مطالعہ کرتا چلا آ رہا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ سب کی دعوت ایک ہی ہے۔ تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ان کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ میں جواب میں یہ کہا کرتا ہوں کہ اگر آپ واقعی نیک نیتی سے ایسا سمجھتے ہیں تو میرا آپ سے مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ جو جی میں آئے پڑھیئے لیکن

طلوع اسلام کا مطالعہ کرنے میں اپنا وقت، توانائی اور پیسہ ضائع نہ کریں۔ آپ کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں کہ آپ طلوع اسلام کی دعوت کو صحیح طور پر سمجھ سکیں اور اس میں اور مذہبی رسالوں کی دعوت میں فرق کر سکیں۔ میری آپ احباب سے درخواست ہے کہ اگر آپ اپنی صفوں میں ایسے لوگوں کو دیکھیں تو انہیں اپنوں میں سے نہ سمجھیں۔ اگر وہ کسی سازش کے ماتحت ایسا نہیں کہتے ــــ نیک نیتی سے ایسا سمجھتے ہیں تو بھی وہ غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں۔ طلوع اسلام کی دعوت منفرد ہے اور، کوئی اور دعوت اس کے مماثل نہیں۔ طلوع اسلام اُس دین کی طرف دعوت دیتا ہے جو عہد محمد رسول اللہ والذین معہ، میں نافذ تھا۔ دوسرے گوشوں کی طرف سے، اسلام کے نام پر اس مذہب کی دعوت دی جا رہی ہے جو ہمارے عہد ملوکیت میں وضع ہوا۔ طلوع اسلام کی دعوت یہ ہے کہ اسلام زندہ نظام (الدین) کی شکل صرف اسلامی مملکت میں اختیار کر سکتا ہے۔ اسلامی مملکت کی عدم موجودگی میں، مذہب ہوتا ہے۔ دین نہیں ہوتا۔ اسلامی مملکت سے مراد ایسی مملکت ہے جس کا جملہ کاروبار خدا کی کتاب (قرآن مجید) کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔ مذہب میں، قوانینِ شریعت (یعنی فقہی احکام) افراد کے مرتب کردہ ہوتے ہیں، خواہ ان کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ دین میں قانون سازی کا اختیار صرف مملکت کو ہوتا ہے اور اس کے مرتب اور نافذ کردہ قانون کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اس طرح اس میں اُمّت واحدہ ہوتی ہے، فرقوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اور جب فرقوں کا وجود نہیں رہتا تو مذہبی پیشوائیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ مذہب سرمایہ داروں کے بل بوتے پر زندہ رہتا اور پنپتا ہے دین میں سرمایہ داری کی جڑیں تک کٹ جاتی ہیں۔ طلوع اسلام کی دعوت، موجودہ مذہب اسلام کی جگہ الدین کو متمکن کرنا ہے۔ یہ تبدیلی اسلامی مملکت ہی کر سکتی ہے، افراد نہیں۔ لہٰذا طلوع اسلام الدین کی خصوصیت اور امتیازات تو پیش کرتا ہے، اُمّت جس طرح شعار (نماز، روزہ وغیرہ) کی پابندی کرتی چلی آ رہی ہے، ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہ خود کرتا ہے، نہ کسی کو اس کا مجاز سمجھتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ طلوع اسلام کا اپنا کوئی الگ فرقہ نہیں۔ یہ ہے طلوع اسلام کی دعوت اور اس کا مسلک۔ اور یہی ہے مجھ بے نوا کی وہ صدا جسے قرآن کے ایک ادنیٰ طالب العلم کی حیثیت سے، قریہ قریہ، بستی بستی، بلند کئے چلا آ رہا ہوں"

عندلیب

حفظِ امانت

رب رحیم وکریم نے اپنی آخری کتاب مبین قرآن حکیم کو تمام نوع انسان کے لیے منشورِ ہدایات بنا کر نازل کیا ہے۔ اس میں وہ سب احکامات وہدایات موجود ومحفوظ ہیں جن کے ہمہ وقت تابع رہنے سے حیات انسانی میں کبھی بگاڑ پیدا نہیں ہوتا اور اصول واقدار قرآنی کی رہبری میں تمام معاملاتِ زندگی اور مسائل شب وروز خوش اسلوبی سے طے پا جاتے ہیں۔ یہ وہ نظریہ ہے جس پر ہم سب بحیثیت مسلمان ایمان رکھتے ہیں اور ایک دوسرے پر اپنی مسلمانی جتانے کے لیے ہم یہ بھی زور وشور سے کہتے رہتے ہیں کہ قرآن ہمارا ضابطۂ حیات ہے، اس میں زندگی کے ہر مسئلے کا حل موجود ہے اور اس کے غیر متبدل اصول ہمیں راستہ دکھاتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے۔ اس راستے پر ہمارے قدم اٹھتے نہیں۔ ہم نے زبان سے الفاظ ادا کر لینے کو مکمل ایمان سمجھ رکھا ہے۔ ہماری غیر حقیقی آزادی ہمیں قرآن کے عطا کردہ اصول وضوابط کا پابند نہیں ہونے دیتی۔ چنانچہ ہم اپنی بُری بھلی خواہشات کے تابع اپنی زندگیاں گزارتے چلے جاتے ہیں۔ اگر ہم قرآن کی طرف سنجیدگی سے دھیان دیں اور پورے غور وفکر کے ساتھ اس کے قوانین، اس کی مستقل اقدار وہدایات کو سمجھنے کی کوشش کریں تو ہم پر واضح ہو کہ ہم قرآن کے نام لیوا عملی طور پر تعلیم قرآن سے کتنے دور جا چکے ہیں۔ ان قرآنی اقدار حیات میں حفظ امانت بھی ایک عظیم قدر ہے جس کے متعلق سورۃ النساء کی ۵۸ ویں آیت میں ارشاد ربانی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ۝ اس آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں یہ حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کی طرف لوٹا دو۔ اس میں نظام مملکت کی امانات بھی شامل ہیں۔ ان سے مراد وہ تمام ذمہ داریاں ہیں جو نظامِ خداوندی کے قیام واستحکام کے لیے تمہارے سپرد کی جائیں۔ یہ وہ امانتیں ہیں جن کی حفاظت کرنا لازم ہے ان میں کبھی خیانت نہیں ہونی چاہیے دوسرے لفظوں میں اگر تفویض شدہ ذمہ داریوں کو پورا نہیں کیا جائے گا تو یہ امانت میں خیانت کرنا ہو گا۔ دوسری بات یہ کہ جب تم لوگوں کے معاملات میں فیصلہ دو تو یہ فیصلہ عدل کے مطابق ہونا چاہیئے یاد رکھو! یہ بڑی اہم بات ہے جو تم سے

کہی گئی ہے۔ یہ حقیقت ہمیشہ اپنے سامنے رکھو کہ جب کوئی اور سننے والا نہ ہو۔ اس وقت بھی ایک سننے والا اور جب کوئی دیکھنے والا نہ ہو اس وقت بھی ایک دیکھنے والا اللہ موجود ہوتا ہے۔

امانات کے حوالے سے مذکورہ آیت ایک جامع مفہوم کی حامل ہے اور حفظ امانت کے تعلق سے اس میں پوری وضاحت پائی جاتی ہے۔ عربی زبان میں امانت اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کے سپرد کی جائے۔ اس اعتبار سے یہ ایک ذمہ داری ہوتی ہے جس کو ایمانداری کے ساتھ پورا کرنا ہم پر لازم قرار دیا گیا ہے۔ اس کا دوسرا نام حفظِ امانت ہے۔ یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ تمدنی زندگی میں افراد معاشرے کو کئی لحاظ سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور ایک کو دوسرے کے تعاون کی ضرورت رہتی ہے۔ ایک دوسرے کی ذمہ داری اٹھانا ہوتی ہے۔ کسی سپرد ہوئے کام کو متعینہ مدت کے اندر اندر سرانجام دینا پڑتا ہے کسی شے کے سپرد ہونے پر اسے وقت مقررہ پر واپس لوٹانا ہوتا ہے۔ یہ سب شعار حفظ امانت کے ذیل میں آتے ہیں اور اس سلسلے میں حکم خداوندی یہی دیا گیا ہے کہ انفرادی طور پر بھی امانتوں کو واپس بحفاظت لوٹا دیا جائے اور اجتماعی طور پر افرادِ مملکت کو جو ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں ان کی تکمیل میں بھی کبھی غفلت نہ کی جائے اور صدق و عدل کے ساتھ ان سے عہدہ برآ ہوا جائے۔ سورۃ المعارج میں مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ۳۲/۷۰ یہ وہ ہیں جو اپنی امانتوں کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنے وعدوں کا پورا پورا پاس رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ امانت میں ہر وہ چیز داخل ہے جسے انسان دوسرے کو سونپ کر اپنے آپ کو امن میں محسوس کرے کیا ہم مومنین کے معاشرے کے افراد ایک دوسرے پہ بھروسہ کر کے امن و سکون محسوس کرتے ہیں؟ یا کر سکتے ہیں؟ ہمارے مومن یا امین ہونے کا یہی ٹیسٹ ہے اور اسی سے ہم خود جان سکتے ہیں کہ ہم اقدارِ خداوندی کے کتنے پابند ہیں! اور حفظ و امانت کو ہم کیا اہمیت دیتے ہیں؟ قرآن کریم میں کئی مقامات پر امانت کے وعدے کی پابندی کا ذکر آیا ہے کیونکہ امانت اور وعدے کا تعلق لازم و ملزوم ہے۔ امانت یا ذمہ داری اسی کے سپرد کی جاتی ہے جو اس کی حفاظت اور ادائیگی کا وعدہ کرتا ہے۔ اسی وعدے کے بھروسے پہ دوسرے کو امن و سکون ملتا رہتا ہے۔ اور وعدے کی سچائی انسانیت کے حُسن و توازن کی ضامن بنتی ہے۔ اس کے برعکس جب امانت میں خیانت کی جاتی ہے۔ دوسرے کے اعتماد کو جھٹک کر توڑ دیا جاتا ہے (عربی زبان میں خیانت کے یہی بنیادی معنی ہیں) تو ظاہر ہے کہ اس طرزِ عمل سے تمدنی زندگی درہم برہم ہو جاتی ہے اور کوئی شخص دوسرے کے ہاتھوں اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ اس کے لیے کسی ثبوت مہیا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارا اپنا معاشرہ اس صورت حال کا آئینہ دار ہے۔

قرآن نے اسی وجہ سے خیانت کو سنگین جرم اور انسانیت کش بُرائی قرار دیا ہے خواہ یہ خیانت انفرادی ہو اور خواہ اس کا تعلق اجتماعی نظام زندگی سے ہو۔ سورۃ الانفال میں فرمان ربّی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ ۸/۲۷ یعنی اے جماعت مومنین تم نہ تو اللہ اور رسولؐ (یعنی نظام خداوندی) سے کسی قسم کی خیانت کرو اور نہ ہی ان ذمہ داریوں کی ادائیگی میں خیانت برتو جو تمہارے سپرد کی جائیں۔ تم جانتے ہو کہ ایسا کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا؟

خیانت کرنے والوں کے لیے یہ بڑی وعید ہے جو قرآن میں متعدد جگہ آئی ہے۔ جس کی "تلاوت" ہم کرتے رہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر قرآن کے الفاظ ادا کر کے ثواب حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد سب کچھ چلتا ہے، ہمارا شعار زندگی ٹھہرا۔ کہاں کی وعید اور کیسی تاکید۔ کون سا وعدہ اور کس کی امانت! جب اپنی خواہشات نفسانی کو اپنا خدا بنا لیا جائے تو کوئی بُرائی بُرائی نہیں رہتی۔ سرکش جذبات کا تابع انسان اپنے مفادات عاجلہ کے لیے کچھ بھی کہتا کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ اقدار کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ امانت میں خیانت وہی کرتا ہے جس کا ایمان مضبوط اور سچا نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ خیانت کرنے یعنی دوسرے کو دھوکہ دینے سے اُسے کچھ حاصل ہو جائے گا تو یہ اس کی فریب نفسی ہے۔ اس فعلِ قبیح سے کچھ حاصل ہونے کی بجائے خود انسانی ذات میں ایسی کمزوری آجاتی ہے کہ وہ صلاحیتیں جو اللہ تعالیٰ نے اُسے ودیعت کر رکھی ہیں پنپنے نہیں پاتیں۔ دبی کی دبی رہ جاتی ہیں۔ اس کو خود اپنی ذات سے خیانت کرنا کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں امانت کی حفاظت کی اہمیت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور خیانت کرنے والوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ سورۃ احزاب میں ارشاد خداوندی ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ یعنی بیشک ہم نے امانت کو آسمانوں زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس میں خیانت کرنے سے انکار کر دیا اور اس خیانت سے ڈر گئے۔ لیکن انسان اس میں خیانت کرتا ہے۔ یہ بڑا ہی ظالم اور نادان ہے۔ آیت جلیلہ یہ بتا رہی ہے کہ خدا نے اپنے قوانین کی اطاعت کی۔ امانت کو خارجی کائنات کے سپرد کیا۔ یعنی ان پر یہ ذمہ داری ڈالی تو انہوں نے اس امانت کی حفاظت کی۔ اس میں کسی قسم کی خیانت نہیں کی اور اس کی کھلی شہادت یہ ہے کہ تمام اشیائے کائنات اپنے ذمے لگائے گئے فرائض کی تکمیل میں شب و روز سرگرم عمل رہتے ہیں۔ لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ اسے قوانین زندگی دیئے گئے تو وہ ان کی اطاعت نہیں کرتا۔ اس طرح وہ اس امانت کا امین بننے کی بجائے خائن بن جاتا ہے بڑا ہی نادان ہے اپنے آپ پر زیادتی کرنے والا۔ امانت میں خیانت کرنا باطل کی کمائی کھانے

کے برابر ہے۔ جس کے لیے حکم خداوندی ہے۔ وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ ۴/۲۹ ایک دوسرے کا مال باطل طریق سے نہ کھاؤ۔ قرآن حکیم بنی اسرائیل کی تباہی کا ایک بنیادی سبب یہ بتایا ہے کہ أَكْلِهِمُ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وہ لوگوں کا مال ناجائز طریق سے کھا جاتے تھے۔ اس صداقت سے یہ اصولی بات سامنے آتی ہے کہ ناجائز طریق سے کھانا خواہ اس کی کوئی بھی صورت ہو سراسر تباہی کی طرف دعوت دینا ہے۔ امانت کی حفاظت نہ کرنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ جائز و ناجائز کی تمیز پر سے ایمان اٹھ جاتا ہے۔ ایمان اور امانت کے تعلق سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت کم ایسا کوئی خطبہ دیا۔ جس میں آپؐ نے یہ نہ فرمایا ہو کہ یہ شخص ایمان سے محروم رہے جو امانت دار نہیں اور وہ شخص دین سے خالی ہے جو اپنے عہد کا پابند نہیں۔ نیز آپؐ نے فرمایا جو شخص امانت دار نہیں وہ خائن ہے۔ اور خیانت صرف روپے پیسے یا مال اسباب میں نہیں ہوتی بلکہ حضورؐ کے ارشاد کے مطابق کسی کا راز افشاء کر دینا بھی خیانت ہے۔ کسی کو غلط مشورہ دینا بھی خیانت ہے۔ اور اپنے اختیار و اقدار کا غلط استعمال بھی امانت میں خیانت کرنا ہے حقیقت یہ ہے کہ امانت و دیانت کا حامل وہی ہو سکتا ہے جو اپنے قول و اقرار اور عہد و پیمان پورے کرتا رہے۔ اسی سے امانت کی حفاظت ہوتی ہے اور یہی دین کی بنیاد ہے۔ مگر یہ اسی صورت میں ہوتا اور ہو سکتا ہے جبکہ قانون مکافات پر یقین کامل ہو۔ یہ یقین انسان کے قدم کبھی ڈگمگانے نہیں دیتا۔ خدا کے قانون مکافات کی کیفیت تو یہ ہے کہ وہ نگاہ کی خیانتوں اور دل کے چھپے ہوئے ارادوں سے بھی واقف ہوتا ہے۔ عمل کو ہم کیونکر اور کس طرح اس سے چھپا سکتے ہیں۔ اس قانون مکافات کی گرفت سے نہ کوئی متنفس بچ سکتا ہے نہ کبھی اس قانون کو شکست دے سکتا ہے۔ اگر ہم فرمان خداوندی کے مطابق اپنے دل سے یہ عہد کریں کہ ہم کسی موقع پر بھی کسی امانت کی حفاظت سے غفلت یعنی بددیانتی اور غیر ذمہ داری کا رویہ اختیار نہیں کریں گے تو ہو نہیں سکتا کہ ہمارے تمام طور طریقے۔ ہمارے تمام پیشے۔ ہمارے تمام محکمے۔ بدعنوانیوں اور ناہمواریوں کے گرداب سے باہر نہ نکل آئیں شرط صرف باہمی تعاون کی ہے۔ امانت کی حفاظت کا مطالبہ یہ ہے کہ معاشرے کا کوئی فرد اپنے اعتماد کو ٹھیس نہ لگنے دے۔ نہ دوسرے کو دھوکا دے۔ نہ خود دھوکا کھائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

بزمِ مذاکرہ طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۸۷ء

ترتیب و پیشکش :- محترم حسن عباس رضوی صاحب ایم اے (فلسفہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

آپ کسی جگہ بھی بات کیجیے، خواہ اس کا موضوع کچھ ہی کیوں نہ ہو، آپ کے سامنے ایک ہی چیز آئے گی کہ ہماری قوم کے نوجوان بے باک ہو چکے ہیں۔ نہ بڑے کا احترام نہ چھوٹے کا خیال اور نہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ۔ نہ درسگاہوں میں نظم و نسق جس سے تعلیمی ادارے بازیچۂ اطفال بن کر رہ گئے ہیں۔ طلبہ تنظیموں نے درسگاہوں کے اندر متبادل ایڈمنسٹریشن قائم کر رکھی ہے۔ یہ سرکشی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ امن و سکون داستانِ پارینہ بن کر رہ گیا ہے۔ نہ محفلوں میں (CORDIALITY) اور نہ گھروں میں سکون۔ ان کی یہ روش زندگی دیکھ کر ہر کس و ناکس گریاں و نالاں ہے کہ سب کچھ غلط تعلیم کا کیا دھرا ہے۔ اگر آپ بہ نظرِ تعمق دیکھیں تو نظر آئے گا کہ اس ہچکولے کھاتی کشتی میں سب یکساں سوار ہیں، یعنی استاد بھی، شاگرد بھی، تعلیمی ادارے بھی اور معاشرہ بھی لیکن خاص طور پر جہاں تک نوجوانوں کا تعلق ہے۔ انتہائے ظلم یہ ہے کہ ہمارے قصرِ مستقبل کے یہ ستون کھوکھلے نظر آتے ہیں اور ہر قلبِ حساس اس خطرہ سے متوحش ہے کہ کہیں ذرا بھی دھچکا لگا تو یہ عمارت چھت سمیت نیچے آگرے گی اور ہم نے قوم کے ان نوجوانوں سے جو امیدیں وابستہ کر رکھی

ہیں وہ یکسر سراب کی نذر ہو جائیں گی۔ خدا نہ کرے ایسا ہو، لیکن اگر ایسا ہوا تو سب کچھ صحیح تعلیم کے فقدان کی وجہ سے ہوگا، جس کا نوٹس لینا وقت کی اہم ضرورت ہے کیونکہ

قہر ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریق عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

لیکن آپ نے کبھی یہ بھی سوچا کہ بستانِ ملت کے یہ نودمیدہ غنچے ایسے نہ تھے جیسے آپ سمجھ رہے ہیں۔ بات کچھ اور ہی ہے۔ !!

سامعینِ کرام! یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نوجوانوں کا طبقہ کسی ملک اور قوم کا طغرہ یعنی (CREST) ہوتا ہے، جس سے وہ قوم پہچانی جاتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قوموں کی تقدیر ہمیشہ ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ان نوجوانوں کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں ان کے گرم خون کی حرارتیں، ان کا زور بازو، ان کا جوشِ کردار ایک کف بداماں سیلاب کی طرح اٹھتا ہے اور ہر ٹکرانے والی قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ قوموں کی تخلیق ان کے نوجوانوں کے کوہ شکن ارادوں کی رہینِ منت ہوتی ہے اس لئے یہی طبقہ تھا۔ جسے طلوع اسلام نے اپنے تصورات کی آماجگاہ، اپنی امیدوں کا مرکز، اپنی تمناؤں کا محور اور قوم کے مستقبل کا مظہر قرار دیا اور اس کو اپنے انقلاب آفرین پیغامات کا درخورِ تخاطب سمجھا۔ اور انہی کے لئے قرآن حکیم کے عظیم مفکر محترم غلام احمد پرویز اقبال کے الفاظ میں بارگاہِ رب العزت میں ہمیشہ دعا مانگا کرتے تھے۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — میرا نورِ بصیرت عام کر دے

طلوع پاکستان کے اندر پچھلے چالیس برس سے کہتا چلا آرہا ہے کہ قوم کی اس متاعِ عزیز کی صحیح تعلیم کا بندوبست کر دیا جائے۔ کیونکہ آپ جس قسم کی قوم بنانا چاہیں اُس کے بچوں کو اس قسم کی تعلیم دیتے جائیں۔ تعلیم بدل جانے سے نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور زاویۂ نگاہ بدلنے سے اشیاء کی اقدار بدل جاتی ہیں جب اقدار بدل جائیں تو دنیا کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ ایسی تعلیم کے لئے طلوع اسلام نے یہ حل پیش کیا کہ پاکستان کے اندر ایسی درسگاہیں قائم کی جائیں جہاں تعلیم کا محور وہ اقدار ہوں جو کتاب اللہ میں بیان کی گئی ہیں۔ ایسی درسگاہوں کے سلسلہ میں پاکستان کے ممتاز قانون دان اور سابق وحدت مغربی پاکستان کے چیف جسٹس محترم ایم۔ آر کیانی (مرحوم) نے ۱۹۶۱ء کے زرعی یونیورسٹی لائل پور (فیصل آباد) کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر فرمایا۔

"تعلیمی درسگاہوں کے پیش نظر یہی نہیں ہونا چاہیئے کہ طالب علم ایک معینہ مدت کے بعد صرف اسناد ہی لے کر فارغ ہوں، بلکہ وہ اسناد کے ساتھ ان درسگاہوں سے انسان بن کر نکلیں اگر آپ چاہتے ہیں کہ طلبہ ان درسگاہوں سے انسان بن کر نکلیں تو ان درسگاہوں کے اندر لامحالہ اس فکر کو اپنانا ہوگا جو طلوع اسلام نے پیش کی ہے۔"

لیکن صد حیف کہ آج تک اس ضرورت کی طرف دھیان نہ دیا گیا جس کے نتیجہ میں ہماری تعلیم بے سمت ہو چکی ہے۔ معیارِ تعلیم دن بدن گرتا چلا جا رہا ہے اور کوئی رُک کر یہ نہیں سوچتا کہ اس کشتی کے ناخدا اسے کس طرف لئے جا رہے ہیں۔ مروجہ نظامِ تعلیم اور معیارِ تعلیم سے ہر کوئی نالاں ہے، استاد بھی، شاگرد بھی، اس کی وجوہات کا جائزہ لینے کے لئے، حسبِ سابق طلوع اسلام کی اس کنونشن میں ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا ہے اور اس اہم شعبۂ زندگی کے متاثرین و ماہرین یعنی سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ، طالبات اور اساتذہ صاحبان کو اظہار رائے کی دعوت دی گئی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ ان کی نظر میں اس کے کیا اسباب ہیں اور ان کی اصلاح کی کیا صورت ہے؟

مَوضُوعِ مذاکرہ

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

ہماری تعلیم بے سمت ہے

ہمارے نظامِ تعلیم، معیارِ تعلیم سے ہر کوئی نالاں ہے، استاد بھی، شاگرد بھی، اس کی کیا وجوہ ہیں؟

نظامِ تعلیم ؟ ، سلیبس ؟

طالب علم ؟ ، استاد ؟

زبان جس میں تعلیم دی جاتی ہے؟

گھر کا ماحول ؟ ، سوسائٹی ؟

اظہار رائے کی دعوت ، طلباء طالبات ، اساتذہ اور والدین

خالدہ سرور (ایم اے)

مذاکرہ

(۱)

(عزیزہ بیٹی خالدہ سرور (ایم۔اے) کا مقالہ جن کی غیر حاضری میں عزیزہ بیٹی صالحہ نعمی نے پیش کیا)

معزز حاضرین! السلام علیکم۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو اُسے عقل و شعور بخشا اور اسی شعور کی بنا پر کہا کہ "ہم نے تم کو اشرف المخلوقات بنایا" عقل و شعور ہی انسان کو حیوان سے برتر بناتا ہے۔

صدرِ گرامی! تعلیم شعور کو جلا بخشتی ہے، اس میں نکھار پیدا کرتی ہے، خوب سے خوب تر بناتی ہے۔ اور یوں سمجھئے کہ حیوان کو انسان بناتی ہے۔ اور اسے انسانیت کے بلند درجوں تک لے جاتی ہے، مگر ہماری منزل صرف اچھا انسان ہونا ہی نہیں۔ بلکہ اُس سے آگے ہے اور وہ ہے اچھا مسلمان ہونا۔ انسانیت کے مقاصد تو صرف بلند ہیں، جبکہ مسلمانی کے مقاصد بلند ترین ہیں۔ بقول علامہ اقبال ؒ

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی

اور یہ منزل صرف صحیح سمت میں صحیح تعلیم حاصل کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

صدرِ ذی وقار! یہی وجہ ہے کہ جب انسان کی طرف وحی کی روشنی آتی ہے تو پہلا سبق یہ ملتا ہے۔

اِقْرَاْءِ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ

پڑھ اپنے رب کے نام سے

اور یہ محض ایک آیت پڑھنا ہی نہیں ہے۔ یہ ایک صدائے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے جو مومن کے قلب سے پیدا ہوتی ہے اور ایک انقلاب برپا کر دیتی ہے ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود　　جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

عرب کے جاہل بدّو "مُہر و پروین کے امیر" بنتے ہیں۔ فارس و روم جیسی عظیم سلطنتوں پر اسلامی جھنڈا لہرایا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ جیسے شاہکار پیدا ہوتے ہیں کہ جو جگرِ لالہ میں ٹھنڈک پیدا کر سکتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ دریاؤں کے دل بھی دہلا سکتے ہیں۔ جو "حلقہ یاراں میں بریشم کی طرح نرم" اور "رزمِ حق و باطل میں فولاد" بن جاتے

ہیں۔ اور یہ تمام اُس صدائے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا ظہور ہے۔

جنابِ صدر! ہر پچھلی نسل کو اگلی نسل REPLACE کرتی ہے۔ جب ماجھی بوڑھا ہو جاتا ہے تو نوجوان آگے بڑھتا ہے۔ اور اپنے توانا بازوؤں اور مضبوط ارادوں سے طوفانوں کا مقابلہ کرتا، بھنور سے بچتا بچاتا ناؤ کو کنارے پر لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح ہر قوم کا مستقبل اُس کی نوجوان نسل کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے فرمایا تھا ؎

جواں ہوں میری قوم کے جسور و غیور
قلندری میری کچھ کم سکندری سے نہیں

انہوں نے حقیقت کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ ایک حسین آرزو بھی بن گئی ہے۔

مگر صدرِ گرامی! جب میں نئی نسل پر نگاہ دوڑاتی ہوں، سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ آج کے نوجوان کا فارس و روم فتح کرنے والی نسل سے مقابلہ کرنا تو درکنار، میں تو شاید اس کا مقابلہ اپنے اُن بزرگوں سے کرنے کی جرأت بھی نہ کر سکوں جو کہ ہال میں موجود ہیں۔ میرے ان بزرگوں میں کئی ایسے ہیں جو اپنی ذات میں عجیب وسعت و گہرائی رکھتے ہیں۔ ایک بار اُن سے ملئے اور پھر بار بار ملنے کی آرزو کیجئے۔ ان سے ملنے کے بعد اک قلبی سکون محسوس ہوتا ہے۔ مگر آج کا جواں بظاہر فٹ اور سمارٹ لیکن اندر سے اتنا بیمار اتنا بیمار کہ کچھ مت پوچھئے۔ مغرب زدہ خیالات، اخلاقی اقدار پامال، بے سکون، بے راہ رو، بھاگتا ضرور ہے مگر منزل سے پرے پرے اور پرے۔ کسی قوم کی باگ ڈور سنبھالنا تو دور کی بات ہے۔ یہ تو اپنے آپ کو بھی سنبھالنے کے قابل نہیں ہے۔

جنابِ صدر! ایسا کیوں ہے؟ ترقی کے اس دور میں اتنا اندھیرا کیوں؟ اگر ذرا غور کریں تو سب صاف ظاہر ہو جائے گا کہ ہمارا نظامِ تعلیم ہمیں ان راستوں پر لے جا رہا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعلیم حاصل کرنے والے تو وہی نوجوان ہیں ناں کہ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ تو پھر نظامِ تعلیم کا کیا قصور؟

لیکن صدرِ گرامی! ہمارے نظامِ تعلیم سے تو نوجوان ہی نہیں۔ بلکہ اساتذہ بھی نالاں ہیں۔ اور اس بات کی تائید یہاں بیٹھے ہوئے اساتذہ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ ہماری نئی تعلیم ہی ہے جو انسان کو حیوان بنا رہی ہے اور زندہ کو مردہ کر رہی ہے۔ اسی کے متعلق تو اقبال نے فرمایا تھا۔

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مردہ ہے مانگ کر لایا ہے فرنگی سے نَفَس

اکبر الٰہ آبادی بات کو مزاح کا رنگ دے کر بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

صدرِ ذی وقار! یہ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ کہ ہمارا معاشرہ ایک رِستا ہوا ناسور بن چکا ہے۔ کسی پہلو پر غور کیجئے۔ سوائے مایوسی اور دُکھ کے کچھ اور ہاتھ نہیں آتا۔ ایک فرد کو لیجئے یا پوری قوم کو، بس یوں لگتا ہے۔ کہ مایوسی، دُکھ، بے اعتباری، بے یقینی اور بے سکونی کی ایک گہری دَبیز دھند ہے جو سب کو اپنی لپیٹ میں لئے جا رہی ہے۔

صدرِ گرامی! انسان ایک Social Animal ہے۔ وہ اکیلا نہیں رہ سکتا۔ ہر انسان کے ارادے سوچ اور عمل کا اثر دوسرے پر ضرور پڑتا ہے۔ گھر کا ایک فرد بیمار پڑ جائے تو دوسرے تمام افراد اُس کی بیماری سے جسمانی طور پر نہیں تو ذہنی طور پر ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ اور جس گھر کے تمام افراد بیمار پڑ جائیں تو اس گھر کا کیا حال ہوگا۔ ہماری قوم کی حالت بھی یہی ہے۔ گو یہ بیماری جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہے۔ اور اسی بیمار نظامِ تعلیم کا کرشمہ ہے۔

جنابِ صدر! خودی کا جذبہ وہ جذبہ ہے جو انسان کو شرفِ انسانیت بخشتا ہے، جو اُسے زندگی کی منازل احسن طریقے سے طے کرنے میں مدد دیتا ہے، جو اُسے خدا سے قریب تر کرتا ہے۔ کسی فرد کی زندگی پر نگاہ ڈالیے یا کسی قوم کے عروج و زوال پر۔ خودی کی بلندی اسے بلند کرتی ہے۔ اور خودی کی موت اُسے موت سے بھی اتھاہ گہرائیوں میں غرق کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے فرمایا تھا ؎

خوار کبھی جہاں میں ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور فقر ہو جس کا غیور

مگر افسوس کہ جو نئی تعلیم ہم حاصل کر رہے ہیں وہ صرف اور صرف خودی کی موت ہے کچھ اور نہیں۔ اقبال نے کہا تھا ؎

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اُس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اُسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اِک ڈھیر

جنابِ صدر۔ کیا آج کا تعلیم یافتہ شخص اِسی شعر کی عملی صورت نہیں بن گیا؟ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ہمارے گھر ایک اماں آیا کرتی تھی۔ اور بڑی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کیا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ

اُس نے اپنا کوئی خاندانی تنازعہ بیان کیا۔ میں نے اپنے خیال میں اُس کا حل بتایا۔ کہنے لگی میرے گھر کے لوگ ایسا کرنے کو کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ میں نے کہا کیوں راضی نہیں ہوں گے۔ میں کئی پڑھی لکھی Families کو جانتی ہوں۔ جنہوں نے یہ مسئلہ اس طرح حل کیا ہے۔ کہنے لگی "بی بی تمہاروں نئیں پتہ۔ ان پڑھ لوگ بڑے ہی غیرت مند ہوندے نیں۔ پڑھے لکھے اس طرح کر سکدے نیں پر ان پڑھ نئیں (بی بی تم نہیں جانتی۔ ان پڑھ لوگ بڑے ہی غیرت مند ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے تو ایسا کر سکتے ہیں لیکن ان پڑھ نہیں۔) بات تو اِسنے بڑی گہری کہی گو کہی اپنے رنگ میں۔ واقعی پڑھے لکھے لوگ Liberal And Broad minded ہونے کے چکر میں اپنی غیرت، شعور اور خودی کو میٹھی نیند سلا دیتے ہیں؟ پھر تبھی تو اس قسم کے سوالات جنم لیتے ہیں:-

"جب برصغیر کے لوگوں کا کلچر، رنگ، رہن سہن ایک سا ہے تو پھر درمیان میں یہ لائن کیوں؟ جب دولت کی تقسیم کا نظام ایک سا ہے تو پھر اسلام اور سوشلزم ایک ہوئے ناں؟ اسلام اس وقت تو اپنے نتائج پیدا کر سکتا تھا۔ جب انسان کھجور اور زیتون پر گذارہ کرتا تھا مگر آج کے سائنسی دور میں نہیں" وغیرہ وغیرہ

صدرِ گرامی کیا اس سوچ پر ماتم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

FRANCIS BACON نے کہا تھا۔

"WHEN I LOOK AT THE MODERN AGE, I FEAR .....
I FEAR NOT BECAUSE THE ROBOTS WILL BEGIN TO THINK LIKE HUMAN BEINGS, BUT THE HUMAN BEINGS WILL BEGIN TO THINK LIKE ROBOTS."

مگر مجھے خوف اس بات کا ہے۔ کہ اگر ہماری تعلیم کا انداز یہی رہا تو ہماری سوچ حیوانوں جیسی بلکہ شاید ان سے بھی بدتر ہو جائے۔

لیکن صدرِ گرامی! دُکھ تو اس بات کا ہے۔ کہ اکثریت کو بہتری کی ضرورت ہے نہ تمنا۔ اتنی سی بات تو انگریز جنہیں ہم "کافر" کہہ دیتے ہیں، وہ بھی جانتے ہیں۔ ایک انگریزی مقولہ ہے۔

"EDUCATION MEANS NOT ONLY ACQUIRING KNOWLEDGE BUT ALSO FRAMING OF YOUR CHARACTER."

لیکن ہم تو یہ بات بھی بھول چکے ہیں اور اپنی اس حالت پر بہت خوش ہیں۔ اوّل تو لوگ اسے بدلنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے اور کچھ اگر سمجھتے بھی ہیں تو وہ یہ کہہ دیتے ہیں۔ کہ ہاں جی! دین سے دوری ہمیں اس طرف لے جا رہی ہے۔ دین کو تو نظامِ تعلیم میں مرکزی حیثیت حاصل ہونی چاہیئے اور پھر دین کے نام پر

چند آیات، چند سورتیں، چھ کلمے اور صفتِ ایمان وغیرہ پڑھا دی بلکہ رٹا دی جاتی ہیں۔

صدرِ گرامی! اگر موجودہ نظامِ تعلیم پر نگاہ دوڑائی جائے تو وہ بنیادی طور پر انگریز سے مستعار لیے ہوئے سلیبس پر مبنی ہے۔ جیسے اسلامی رنگ دینے کے لیے چند آیات اور "ملائی" خیالات کے "ٹوٹے" بیچ میں لگا دیئے جاتے ہیں۔ اور اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ مگر اپنے اپنے PROFESSION میں تو قابل ہوتے مگر ایسا بھی نہیں ہے۔ ڈگری تو دکھانے کو بے شک ہوتی ہے۔ مگر تعلیمی قابلیت کی حالت نہ ہی پوچھئے تو بہتر ہے۔ یہ باتیں تو ہم اکثر ہی سنتے ہیں۔ کہ آج کے ایم۔ اے سے پرانا میٹرک اچھا تھا۔ یا یہ کہ آج کا گریجوئیٹ تو اپنے لئے ایک درخواست بھی نہیں لکھ سکتا۔

صدرِ ذی وقار! سوال یہ ہے کہ پھر ہمارا نظامِ تعلیم کیسا ہونا چاہیئے؟ اس کے لیے ہمیں پہلے اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھنا ہوگا۔ اور وہ مقصد ہے کہ مسلمان فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں وحیٔ خداوندی کی روشنی میں نوعِ انسان کی منفعتِ عامہ کے لیے استعمال کریں۔ اسلامی تعلیم کا مقصد ہے۔ ع

از کلیدِ دیں درِ دُنیا کُشاد

اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تعلیم کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ طالب علم تاریخ پڑھیں یا فلسفہ، سیاسیات کا مطالعہ کریں یا معاشیات کا یا عمرانیات کا، انہیں بتایا جائے کہ علم کا یہ شعبہ اس مقصد کی تکمیل میں کس حد تک معاون اور مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ قوم کے طالب علموں پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ انفرادی معاملہ ہو یا اجتماعی، اپنی زندگی کو وحی کے تابع رکھنا ہی شرفِ انسانیت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس سے انکی سیرت میں پختگی اور کردار میں وہ پاکیزگی پیدا ہو جائیگی کہ جس کے فقدان کا ہم اس وقت رونا رو رہے ہیں۔

صدرِ گرامی! ہمیں صحیح اسلامی اقدار اور زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ایسا نظامِ تعلیم وضع کرنا چاہیے جو صحیح مسلمان پیدا کرے۔ جو کائنات کو فتح کر کے اسے انسانی تصرف میں لائیں۔ جو آسمانی کروں کو فتح کریں۔ لیکن حکمِ خداوندی کے آگے ہمیشہ جھک جائیں۔ ہمارا نظام تعلیم ایسا ہو جو اقبال کے شاہیں پیدا کرے، جن کی خودی صورتِ فولاد ہو۔ ہمارا نظامِ تعلیم ایسا ہو کہ جس کی روشنی میں مسلمان قہار ہو۔ جبار ہو۔ امین شانِ قدوسی و جبروت ہو۔ ہمارا نظامِ تعلیم ایسا ہو کہ "بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چلے"۔ ہمارا نظامِ تعلیم ایسا ہو جو "دلوں کو پیغامِ سجود" یاد دلائے اور "جبینوں کو خاکِ حرم سے آشنا کر دے" اگر ایسا ہو جائے تو دنیا ایک بار پھر دیکھے کہ اسلام چلا ہوا کارتوس نہیں۔ یہ نہ صرف چودہ سو سال پہلے انقلاب لا سکتا تھا۔ بلکہ آج بھی وہی انقلاب برپا کر سکتا ہے ؎

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ لک ذکرک دیکھے

والسّلام

تسنیم کوثر متعلمہ ایم اے انگلش فائنل

مذاکرہ

(۲)

یہ صحیح ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیم، معیارِ تعلیم سے ہر کوئی نالاں ہے، استاد بھی شاگرد بھی۔ لیکن اس کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں محض تنقید کا ہی سہارا نہیں لینا چاہیے۔ کیونکہ مرض کی تشخیص اور علاج کے لیے مثبت اور صحت مند طرزِ عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر تعصب سے ہٹ کر دیکھا جائے تو نظامِ تعلیم کے انحطاط کی وجہ خدا کے بتائے ہوئے اصولوں سے انحراف ہے۔ مرض وہی ہے جو آدم کو لاحق ہوا تھا۔ اور علاج بھی انہی خطوط پر ہے جو آدم کے لیے تجویز کیا گیا تھا۔ یعنی قانونِ الٰہی کا اتباع۔ وہ اس لیے کہ قانونِ الٰہی مبنی بر خیر ہے۔ اس کی تشریح قرآن کریم کی سورۂ نحل میں یوں کر دی کہ

"مومنین سے ان کے مخالفین سوال کرتے ہیں کہ ہمیں بتاؤ تمہارے رب نے تمہاری طرف کیا نازل کیا ہے؟"

تو مومنین اس کے جواب میں کہتے ہیں "خَیْرًا" (۱۶/۳۰)

اور اس کی وضاحت اس طرح کر دی گئی کہ

"جو لوگ حُسن کارانہ انداز سے عمل کرتے ہیں، ان کے لیے اسی دنیا میں بھی ہر قسم کی خوشگواریاں ہیں اور آخرت یعنی مستقبل کی زندگی میں بھی خوشگواریاں"

لہٰذا، ہر وہ عمل جس کا نتیجہ حال اور مستقبل (دنیا و آخرت) کی خوشگواریاں ہوں، خیر ہے۔

جہاں تک کائنات اور انسان کی قوتوں کا تعلق ہے۔ کوئی شَے فِی نَفْسِہٖ، نہ خیر ہے نہ شر، ہر چیز میں خیر کا پہلو بھی ہے اور شر کا بھی۔ یہ کسی شے کا طریقِ استعمال ہے جو اس چیز کو خیر یا شر بنا دیتا ہے۔ مثلاً پانی سے مَزْرَعِ حیات پھلتی اور پھولتی ہے۔ یہ اس کا خیر کا پہلو ہے۔ لیکن جب یہ پانی اندازے سے بڑھ جائے تو تباہی کا باعث بنتا ہے۔ یہ اُس کا شر کا پہلو ہے۔ ندی نالے جب اپنے ظرف کے مطابق بہتے ہیں تو وجۂ شادابیٔ حیات بنتے ہیں۔ یہ ان کا خیر کا پہلو ہے۔ لیکن جب یہ حدود و قیود توڑ کر سرکش ہو جاتے ہیں تو

گردونواح کی آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ زندگی جان چھپاتی پھرتی ہے۔ یہ اُن کا شر کا پہلو ہے دریا اس وقت تک دریا کہلاتا ہے جب تک اس کا پانی ساحلوں میں پابند ہے۔ اگر یہ ان ساحلوں کو توڑ کر حدود فراموش ہو جائے تو اسے دریا نہیں بلکہ سیلاب کہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ تخریب ہی تخریب ہے..... تاہم دریا اسی وقت سرکشی اختیار کرتے ہیں جب ان کی روانی اور گزرگاہوں کو صحیح اندازے کے مطابق پابند سواحل نہیں کیا جاتا۔ چین کا دریائے زرد، ہر سال اپنی گزرگاہ تبدیل کرتا اور اطراف واکناف میں تباہی مچا دیتا۔ ملک کو ہر سال ایک نئی قیامت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اب اس سرکش دریا کو اس طرح قانون کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے کہ کیا مجال جو وہ اپنی گزرگاہ اور رُخ بدلنے کا ارادہ بھی کرے۔ گویا وہ اسباب ہی ختم کر دیئے گئے ہیں۔ جو اسے سرکشی پہ آمادہ کیا کرتے تھے۔

دریا اپنی روانی کی خاصیت ورثہ کے طور پر اُس مقام سے حاصل کرتا ہے، جہاں سے وہ نکلتا ہے اُس کی روانی کا انحصار اُس کی گزرگاہ پر ہے۔ جیسی گزرگاہ ہوگی، ویسی ہی دریا کی روانی ہوگی۔ لیکن اگر کوئی قاعدے اور قانون کے مطابق گزرگاہ نہ ہو تو دریا جب سیلاب کی صورت اختیار کرتا ہے۔ تو پانی گردو نواح میں پھیل جاتا ہے۔ اور راستے میں آنے والی ہر شے کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ لیکن اگر دریا کی گزرگاہ کو کسی قاعدے اور قانون کی رو سے پابند کر دیا جائے تو سیلاب خواہ کتنی ہی شدت کا کیوں نہ ہو۔ اپنی روانی کو حدود کے اندر رکھتا ہے۔ یا جو متبادل انتظامات کئے جاتے ہیں۔ اُن کے اندر پابند رہتا ہے نہیں بلکہ اس کی سرکشی کو ایسے سانچوں میں ڈھال دیا جاتا ہے۔ جس سے انسان اپنی مرضی کے مطابق کام لیتا ہے۔ اس طرزِ عمل کو دریا کا (TAMING) اور (HARNESSING) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جب دریاؤں کی روانیاں اور طغیانیاں انسان کے حیطۂ اختیار میں آجاتی ہیں تو اس مقام پر خُدا کہتا ہے۔ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ (۱۴/۳۲) اس طرح ہم نے تمہارے لئے دریا مُسخّر کر دیئے۔

اب آگے بڑھیئے اور انسانی دنیا میں آجایئے۔ انسانی بچہ جب پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ انسانی کیفیت اور ماہیت اور نشوونما کے میلانات اپنے ماں باپ سے ورثہ میں لے کر پیدا ہوتا ہے جسے (HEREDITY) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی بچہ ورثہ کی وجہ سے انسان بنتا ہے۔ اور دوسری انواع واقسام (SPECIES) سے علیحدہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انسانی بچہ میں خدا کی طرف سے، پیدائشی اعتبار سے اس کی INBORN صلاحیتیں، پوشیدہ اور خوابیدہ یعنی (DORMENT) اور (LATENT) شکل کے اندر ہوتی ہیں۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (۹۱/۸)

"پھر انسان کے اندر تعمیر وتخریب دونوں کی صلاحیت بھی رکھ دی گئی ہے۔"

یہی وہ چیز ہے۔ جو انسانی بچہ کو دیگر حیوانی بچوں سے متمیز کرتی ہے۔ جہاں تک انسان کی حیوانی سطح کا تعلق ہے، اس کی نشوونما "پختگی" یعنی "MATURATION" سے ہوتی ہے جو "PHYSICAL LAWS" کے تابع ہوتی ہے۔ اس کے برعکس انسانی بچے کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا انحصار، اُس ماحول یعنی "ENVIRONMENT" پر ہوتی ہے۔ جسے انسانی بچہ یا تو از خود اختیار کرتا ہے، یا اُسے میسر آتا ہے۔

اب ذرا پیچھے چلیئے اور دریا کی مثال کو سامنے لایئے۔ دریا جس مقام سے نکلتا ہے۔ وہاں سے روانی کی تعمیری اور تخریبی صلاحیتیں لے کر نکلتا ہے۔ جس طرح انسانی بچہ کے اندر فجور و تقویٰ کی صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ دریا کے تعمیری اور تخریبی کردار کا انحصار گزرگاہ کی کیفیت پر ہوتا ہے۔ جیسی گزرگاہ ہوگی، ویسا ہی دریا کا کردار ہوگا۔ پانی کی دنیا میں اس گزرگاہ کی مثال انسانی دنیا کی "ENVIRONMENT" کی مثال ہے۔ انسانی دُنیا کا ماحول "ENVIRONMEMT" بھی ایک گزرگاہ ہے۔ جس طرح دریا اس وقت تک دریا رہتا ہے جب تک اُس کا پانی ساحلوں میں پابند رہتا ہے۔ اسی طرح انسان اس وقت تک انسان کہلا سکتا ہے جب تک وہ قانونِ خداوندی کے ساحلوں میں محصور رہتا ہے۔ جس طرح دریا ساحلوں کو توڑ کر حدود فراموش ہو جائے تو وہ دریا نہیں رہتا بلکہ وہ سیلاب کہلاتا ہے جس کا نتیجہ تخریب ہی تخریب ہوتا ہے اسی طرح اگر انسان قوانینِ خداوندی کے مقرر کردہ حدود قیود یعنی ساحلوں کو توڑ کر سرکش و بیباک ہو جائے تو انسان، انسان نہیں رہتا بلکہ حیوان نظر آتا ہے۔ یوں کہئے کہ شیطان بن جاتا ہے۔ جس سے معاشرہ کے اندر تباہی اور بربادی کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔

آجکل ہمارے نوجوان طبقہ، خاص کر طالب علموں کے اندر، ساحل فراموشی اور سرکشی اس حد تک بڑھ گئی ہے۔ کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب توڑ پھوڑ، آتش زنی، پتھراؤ، خون خرابہ، ہڑتال۔ ناکہ بندی اور تالہ بندی کے واقعات رونما نہ ہوتے ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نظم و نسق درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ کوئی شخص بھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ اس بربریت اور سبعیت کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے انسان نے انسان کو کھو دیا ہے ؎

وائے ناکامی، متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے، احساسِ زیاں جاتا رہا

لیکن یہ سب کچھ اُس نظامِ تعلیم کی بدولت ہے جسے ہم نے پاکستان بننے کے ساتھ انگریز سے ورثہ میں لیا تھا اور یہ وہ نظامِ تعلیم ہے جس نے خود یوروپ کے نوجوان طبقہ کی کیفیت ایسی بنا دی ہے جس پر ایک مغربی مفکر جوڈ یوں مرثیہ خواں ہے۔

"ہمارا نوجوان طبقہ شاہراہِ زندگی پر بلا تعیّنِ مقصد چلا جا رہا ہے۔ انہیں کچھ علم نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ بلکہ یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم چل ہی کیوں رہے ہیں۔ نہ ان کے سامنے کوئی ضابطہ زندگی ہے، نہ آئینِ حیات، نہ اقدار، نہ معیار۔"

یہ تو تھا جو کچھ یورپ کے نوجوانوں کے ساتھ ہوا۔ لیکن جو کچھ ہم پر گزری ہے، وہ ایک عظیم المیہ ہے۔ ہم اس نظامِ تعلیم کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں۔ جس سے خود اس کے وضع کرنے والے بھی نائب نظر آتے ہیں۔ جس چیز کو وہ زوال کا سبب قرار دیتے ہیں، ہم اُسے اپنے کمال کا زینہ سمجھتے ہیں۔

لیکن ایک قرآنِ کریم کے طالب علم کیلئے یہ بتانا مشکل نہیں کہ نظامِ تعلیم کیا ہونا چاہیے۔ اور درس گاہیں کیسی ہونی چاہئیں۔..... درس گاہیں جو ایسے طالب علم تیار کریں کہ

۱۔ پاکستان میں وقتاً فوقتاً جو مسائل سامنے آئیں وہ بتا سکیں کہ اس باب میں قرآن کیا رہنمائی دیتا ہے۔

۲۔ اسلامی مملکت کا آئین کیسا ہونا چاہیے اور قوانین کس قسم کے۔

۳۔ افراد کی زندگی اسلامی قالب میں کسطرح ڈھل سکتی ہے۔ اور معاشرہ قرآنی خطوط پر کسطرح متشکل ہو سکتا ہے۔

۴۔ وہ کونسی ایسی عملی کسوٹی ہے جس سے ہر وقت یہ معلوم کیا جا سکے کہ قوم صحیح راستے پر چل رہی ہے یا اس کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا ہے۔

۵۔ دنیا کی مختلف قومیں اس وقت جن معاشی، معاشرتی، سیاسی، قومی اور بین الاقوامی مسائل سے دوچار ہیں اور جن کا کوئی اطمینان بخش حل نہیں ملتا۔ جس کی وجہ سے امنِ عالم سخت خطرے میں پڑ رہا ہے۔ قرآنِ کریم ان مسائل کا حل کیا تجویز کرتا ہے۔

۶۔ اس درس گاہ کے فارغ التحصیل طالب علم ایسی قابلیت کے مالک ہوں کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے اجتماعات میں قرآنی نکتۂ نگاہ نہایت وضاحت سے پیش کر سکیں۔ اور اپنے ملک میں دوسروں کی رہنمائی کر سکیں۔

۷۔ ذہنی قابلیت کے علاوہ انکا کیریکٹر بھی اتنا بلند ہونا چاہیئے کہ وہ دوسرے نوجوانوں کے لیے قابلِ تقلید مثال پیش کر سکیں۔ اور اس طرح اس حقیقت کی زندہ شہادت بن سکیں کہ جب انسانی قلب و دماغ قرآن کے قالب کے اندر ڈھل جائیں اور وہ سیرت نبی اکرمؐ کو اپنے سامنے بطور اُسوۂ حسنہ رکھ لیں تو اس سے کسطرح ایسے انسان پیدا ہوتے ہیں جن پر انسانیت فخر کر سکے۔

گرامی قدر! جب ایسی درسگاہیں قائم ہو جائیں گی تو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی کہ ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا کہاں سے آئے صدا، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

شکریہ

حسن عباس رضوی

تھیاکریسی

مذہبی پیشواؤں کا نظام

۱۹۷۳-۷۴ء میں جب میں بہاولپور تعینات تھا، تو محکمہ کے ایک اہلکار نے اپنی تنزلی کے سلسلہ میں ایڈمنسٹریٹو سول جج مظفر گڑھ کے فیصلہ کے خلاف، ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج مظفر گڑھ کی عدالت میں اپیل دائر کر رکھی تھی۔ اس ضمن میں حکومت کی طرف سے، اس مقدمہ کی پیروی کے لیے مجھے مامور کیا گیا تھا۔ ایک تاریخ پیشی پر جب ہم ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کی عدالت پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس دن مقدمات کی کاروائی ۱۲ بجے دوپہر شروع ہوگی۔ کیونکہ وکلا صاحبان اُس وقت تک ہڑتال کئے ہوئے ہیں اور عدالتوں میں حاضر نہیں ہوں گے، حالانکہ وکلا کی معتدبہ تعداد عدالتوں کے احاطہ میں موجود تھی۔ تھوڑی دیر بعد پتہ چلا کہ وکلا صاحبان کا ایک گروہ بھٹو مرحوم کے خلاف مظاہرہ کرے گا اور جلوس بھی نکالے گا۔ ہم بھی یہ کاروائی دیکھنے چلے گئے اور واقعی جلوس نکلا ہوا تھا اور وکلا صاحبان نے بینر اور کتبے اُٹھا رکھے تھے جن پر بھٹو مرحوم کے خلاف نعرے لکھے ہوئے تھے۔ اور خود بھی وکلا صاحبان نعرے لگا رہے تھے۔ خیر مظاہرہ ختم ہوا۔ عدالتوں میں مقدمات کی کاروائی شروع ہوگئی۔ کوئی تین بجے بعد دوپہر عدالت سے فارغ ہو کر ہم جا رہے تھے کہ ویسا ہی ایک جلوس اور نکلا ہوا تھا جس کے شاملین نے بھٹو مرحوم کے حق میں بینر اور کتبے اُٹھا رکھے تھے، جن پر بھٹو مرحوم کے حق میں نعرے لکھے ہوئے تھے اور لوگ ان کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ وکلا کی کافی تعداد بھی اس جلوس میں شامل تھی۔ یہ منظر دیکھ کر ہم حیران رہ گئے کہ وکلا کے اس گروپ نے اتنی جلدی اتنے بینر اور کتبے کیسے تیار کروا لیے۔ اتفاق کی بات ہے کہ جس مقام پر ہم کھڑے تھے، بینر اور کتبے بنانیوالے کی ایک بڑی سٹور نما دوکان قریب ہی نظر آئی۔ جب جلوس چلا گیا تو ہم نے اس جادوئی عمل کے بارے میں پوچھا تو اُس نے بتایا صاحب! کیونکہ آج مخالفت اور موافقت میں جلوس نکلنے تھے اس لیے ہم نے بھی مخالفت اور موافقت کے بینر اور کتبے تیار کر رکھے تھے۔ جیسی بھی صورت ہو متعلقہ گروپ والے آجاتے ہیں اور ان کو کرایہ پر لے جاتے ہیں اور مظاہرہ کے بعد واپس کر جاتے ہیں۔ ہم نے یہ بات سُن کر ماتھے پر ہاتھ مارا۔

اور مُنہ سے بیساختہ نکل گیا اوہ خُدایا! ہماری یہ قوم کیسی ہے؟ اس کے ساتھ ہی معاً فلیڈمارشل محمد ایوب خان (مرحوم) کے زمانے کا اس طرح کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب عید الفطر کے بارے میں (اور تہواروں کی طرح) رویت ہلال کا اعلان حکومت کی طرف سے ہوا کرتا تھا۔ اس اعلان کا انحصار، سائنسی فلکیاتی، اور موسمیاتی رصدگاہوں (OBSERVATORIES) اور ہیئتِ فلکی اور ریاضی کے ماہرین کی فراہم کردہ اطلاعات ومعلومات پر مبنی ہوتا۔ اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ چوٹی کے حقیقی علماء کا مشورہ بھی لے لیا جاتا۔ تاہم حکومت کے اس اقدام کو مداخلت فی الدین سمجھا گیا۔ اور جس کے ردِعمل کے طور پر ہوتا یہ کہ اگر حکومت کی طرف سے اعلان ہوتا (کہ مثلاً) عید الفطر ۳ نومبر کو ہوگی تو راتوں رات پوسٹر بازاروں اور گلیوں میں آجاتے کہ عید کا چاند نظر نہیں آیا۔ اس لیے عید ۴ نومبر کو ہوگی۔ پوسٹر شائع کرنے والے کا نام اور پتہ پوسٹر پر نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اگر حکومت کی طرف سے اعلان ہوتا کہ عید کا چاند نظر نہیں آیا اس لیے عید ۴ نومبر کو ہوگی، تو پوسٹر بازاروں اور گلیوں میں آجاتے کہ عید کا چاند نظر آگیا ہے اس لیے عید ۳ نومبر کو ہوگی۔ ظاہر ہے ایسے پوسٹروں سے لوگ مخمصہ میں پڑ جاتے کہ "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے"۔ بہرحال متضاد ردِعمل ہوتا۔ تاہم اکثریت حکومت کے اعلان پر عمل کرتی۔ پھر اگلے سال ایسی تخریبی عمل کو دہرایا جاتا۔ آخر کار بڑی خفیہ تحقیقات کے بعد ایک مذہبی جماعت کے صدر دفتر پر چھاپہ مارا گیا۔ اور یہ متضاد قسم کے پوسٹر وہاں سے برآمد ہوئے۔ بہرحال حکومت کو جو کرنا ہو گا وہ کیا ہوگا۔ اس پر حکیم الامت کا ایک مشاہدہ (OBSERVATION) شعر کی صورت میں سامنے آیا کہ

دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد　　دینِ مُلا فی سبیل اللہ فساد

قارئین کو یاد ہوگا کہ بانیٔ پاکستان جناب محمد علی جناحؒ نے مذہبی پیشوؤں کے اس حنفی کردار، ٹیڑھی سوچ اور تخریبی طرزِ عمل، اور قرونِ اُولیٰ کی تاریخی شہادتوں (خاص طور پر خلافتِ راشدہ کے دور) کے پیشِ نظر، تحریک پاکستان کے دوران اور پاکستان کے معرضِ وجود میں آجانے کے بعد برملا کہہ دیا تھا کہ پاکستان تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں ہوگی۔ چنانچہ تحریک پاکستان کے دوران، ۱۱ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے کہا۔

"اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لیے لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین کیا ہے؟ یاد رکھئے! ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔

تقاریر جلد دوم صـ ۳۸۶

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تھیاکریسی کی تعریف بیان کر دی جائے۔ جو انگریزی میں مناسب رہے گی۔

THEOCRACY

"THAT CONSTITUTION OF A STATE, IN WHICH GOD OR A god IS REGARDED AS THE SOLE SOVEREIGN AND THE LAWS OF THE REALM AS DIVINE COMMANDS RATHER THAN HUMAN ORDINANCES. THE PRIESTHOOD NECESSARILY BECOMING THE OFFICERS OF THE INVISIBLE RULER — THE SYSTEM, THUS, REGARDED AS PRIESTLY HEIRARCHY."

مذہبی پیشواؤں کا نظام

پاکستان بن جانے کے بعد، قائداعظمؒ نے پاکستان کے آئین کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے، فروری ۱۹۴۸ء میں اہل امریکہ کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا۔

"پاکستان کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئندہ جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئین پاکستان مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں اُن کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی۔ جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دیدی جائے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔"

تقاریر بحیثیت گورنر جنرل صـ ۶۵

مذہبی پیشواؤں کے مبلغ علم کے بارے میں قائداعظمؒ نے ۱۹۴۱ء میں وضاحت کرتے ہوئے کہا:۔

"پاکستان کی جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے عُلماء کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیم عمل اور اُس کے حدود کیا ہیں، اِن امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کرتی ہے اور (اپنے حلقہ سے باہر) اہلیت، مستعدی کے باوجود میں یا آپ میں (یعنی کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لیے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے

انہیں میں ان مولوی صاحبان میں (اِلَّا مَا شَاءَ اللہ) نہیں پاتا (اور مشکل در مشکل یہ کہ) وہ
کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔
(بحوالہ طلوع اسلام ۱۳ اگست ۱۹۵۵ء)

اس سلسلہ میں ضمناً ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ تھیاکریسی کی اگر یہی کیفیت ہے تو پھر اسلام کے اندر یہ کہاں سے آگئی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اُس وقت معرض وجود میں آئی جب دین کو BIFURCATE کر کے مذہب اور سیاست میں تقسیم کر دیا گیا۔ سیاست کی سربراہی ملوکیت کے حصہ آئی اور مذہب کی اجارہ دار مذہبی پیشوائیت بن گئی۔ گویا اسلام میں تھیاکریسی کا بالکل کوئی وجود اور جواز نہیں، یہ خالصتاً مذہب کی پیدا دار ہے۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ موضوع ہے جس پر کسی اور وقت تفصیلاً عرض کیا جائے گا۔

ذرا پہلے یہ کہا گیا ہے کہ قائداعظمؒ نے تحریکِ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد فرمایا تھا کہ پاکستان کو تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بننے دیا جائے گا۔ اگرچہ تھیاکریٹک سٹیٹ کے تصور کی مخالفت ہمیشہ سے ہوتی رہی ہے پھر بھی یہ سمارورغ اور آکاس بیل کی طرح بڑھتا رہا اور اپنی زد میں آنے والے افراد کی ذہنی GROWTH کو دباتا رہا اور اُن کی ندرتِ فکر اور جدتِ کردار کی صلاحیتوں کو ماؤف کرتا رہا اور اولادِ آدم کے دل و دماغ میں افتراق پیدا کر کے ان کو FRUSTRATION کی راہ پر ڈالتا رہا لیکن جنہیں اللہ تعالیٰ نے قلب سلیم عطا کیا وہ اس کی چالوں میں نہ آسکے، اور کاروانِ انسانیت اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہی رہا۔

مگر مذہبی پیشوائیت کے داعی کب باز آنے والے تھے۔ چنانچہ جو تحریک پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش تھے وہ اب اسقفی لیبل کی آڑ میں عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ پاکستان بنانے میں اُن کا بدرجہ اتم عمل دخل رہا ہے۔ اس لیے پاکستان کے اندر سابقہ حکومتیں جو اسلام کا نظام نافذ نہیں کر سکیں اب وہ لوگ ایسا کریں گے۔ ایک جماعت حسب سابق کھل کر سامنے نہیں آرہی لیکن پیچھے سے تار ہلا کر دوسری تنظیموں کو مظاہروں پر اکسا رہی ہے۔

اگر خدانخواستہ ایسے مذہبی پیشواؤں کا نظام قائم ہو گیا تو ہر وہ شخص، جو اُن کے نظریہ کے مطابق مسلمان نہیں وہ مرتد قرار دے دیا جائے گا اور تختہ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔ اب فیصلہ عوام کے ہاتھ میں ہے۔ کہ وہ ایسا سفاکانہ نظام چاہتے ہیں یا وہ جسے سلامتی کا دین (نظام) کہا جاتا ہے، جو اِن مذہبی پیشواؤں کے خود ساختہ نظام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی بوساطت رحمۃ اللعالمین عطا کیا گیا

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

حقائق و عبر

۱۔ شریعت بل اور ممتاز قانون دان

جناب اے کے بروہی صاحب کو جماعت اسلامی کے حلقوں میں ملک کا سب سے ممتاز قانون دان سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے جماعت اسلامی کی جانب سے پیش کئے جانے والے شریعت بل پر جو تبصرہ کیا ہے۔ روزنامہ نوائے وقت نے اپنی یکم جولائی ۱۹۸۷ کی اشاعت میں اپنے اخبار کے صفحہ اول کے کالم اول پر ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

"راولپنڈی، ۳۰ جون (نمائندہ خصوصی) ممتاز قانون دان اے کے بروہی نے کہا ہے کہ شرعی قوانین کی تشہیر و تشریح کا اختیار صرف عدالتوں کو ہونا چاہیئے نہ کہ اسلامی نظریاتی کونسل کو آج شام یہاں شام ہمدرد کی تقریب میں نوائے وقت سے بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان سے استفسار کیا گیا تھا کہ کیا سینٹ میں زیر بحث بل میں اسلامی نظریاتی کونسل ترامیم کرے تو یہ قابل قبول بل بن سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ شریعت بل کے معاملے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ میں شریعت کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ البتہ شریعت بل میری سمجھ سے باہر ہے۔ یہ ایک سیاسی معاملہ ہے میں اس پر اظہار خیال نہیں کرنا چاہتا۔"

ان کے اس تبصرے کو شائع ہوئے دو ہفتے گزر چکے ہیں۔ لیکن شریعت بل کے کسی علمبردار کی جانب سے انہیں یہ بل سمجھانے کی کوشش نہیں کی گئی

۲۔ ہزاروں لاکھوں احادیث

ہفت روزہ چٹان اپنے ہر شمارے کے پہلے صفحہ پر اسلامی لٹریچر سے انتخاب شائع کرتا ہے۔ اپنے

۲۲ جون ۱۹۸۷ء کے شمارے پر انہوں نے علامہ شبلی کی تحقیق میں سے یہ اقتباس پیش کیا ہے:-

"سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں حدیثیں دانستہ لوگوں نے واضع کرلیں۔ حماد بن زید کا بیان ہے۔ کہ چودہ ہزار حدیثیں صرف ایک فرقہ زنادقہ نے واضع کرلیں۔ عبدالکریم وضاع نے خود تسلیم کیا تھا کہ چار ہزار حدیثیں اُس کی موضوعات سے ہیں۔ بہت سے ثقات اور پارسا تھے جو نیک نیتی سے فضائل اور ترغیب میں حدیثیں واضع کرتے تھے حافظ زین الدین عراقی لکھتے ہیں کہ اُن حدیثوں نے بہت ضرر پہنچایا کیونکہ ان واضعین کے تثقہ اور تورع و زہد کی وجہ سے یہ حدیثیں اکثر مقبول ہوگئیں اور رواج پاگئیں۔" (بہ روایت فتح المغیث بحوالہ کتاب سیرت النعمان)

مصنف:- علامہ شبلی نعمانی

۳- ادارہ تحقیقات اسلامی

علامہ پرویز صاحب ادارہ تحقیقات اسلامی کو ایک ایسا سفید ہاتھی قرار دیتے تھے جو اس قوم کے اصطبل میں زبردستی باندھ دیا گیا ہے۔ علماء اس ادارے کی بابت کیا کہتے ہیں اسے مفتی محمد شفیع (مرحوم) کی زبانی سنیئے جو ان کے ملک کے ترجمان ماہنامہ البلاغ کی جون ۱۹۸۷ء کی اشاعت کے صفحہ ۳ پر نقل کیا گیا ہے۔

"اب یہ تیسری بیماری غیر اسلام کو اسلام بنانا۔ غیر قرآن کو قرآن بنانا ہے اور انفرادی حیثیت سے ہمیشہ یہ کام ہوتا رہا ہے مگر صرف اپنے ایک مخصوص حلقے تک محدود رہا اور اب اجتماعی صورت اختیار کر چکا ہے چنانچہ قانون بنائے جا رہے ہیں اور اسلام کا نام لے کر کفر اختیار کرنا یہ وہ بلا ہے کہ اگر اس میں مبتلا ہو گئے تو نجات نہیں دین کی حیات پر یہ حملہ ہے۔ جب کوئی گناہ خفیہ ہوتا ہے تو اس کا وبال صرف کرنے والے پر پڑتا ہے اور اگر اجتماعی ہو اور اس کو کوئی نہ روکے تو اس کا وبال سب پر پڑتا ہے۔ آج دنیا کے دو پیسہ کے نقصان پر سب کو تکلیف ہوتی ہے دین پر آرے چل جائیں کسی کو خیال نہیں ہوتا۔

حکومت نے لاکھوں روپیہ خرچ کر کے ایک ادارہ قائم کیا "تحقیقاتِ اسلامیہ" لیکن آج تک کسی ایک مسئلے کو شریعت کے مطابق حل کر کے نہیں بتایا۔ بلکہ اس کے برعکس تحریف دین کے درپے ہیں۔"

۴- سرحد پار عائلی قوانین کی صدائے بازگشت

قرآن کریم نے جنسی رشتوں کے قیام کے لیے نکاح کو لازمی قرار دیا ہے اور نکاح کا مقصد بتایا ہے۔
"توانائیوں کی قلعہ بندی نہ کہ انہیں بلا مقصد بہا دینا۔"

مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ..... ۴/۲۴

مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ..... ۴/۲۵

لیکن حدود فراموش انسان، نکاح جیسے مقدس رشتے کو کن کن سافل مقاصد کے پیشِ نظر استعمال کرتا ہے اس کا اندازہ ماہنامہ آستانہ دہلی بابت جون ۱۹۸۷ء صـ ۸ میں شائع ہونے والے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

"گذشتہ دنوں مسلم پرسنل لاء کے سلسلے میں بمبئی کی شہناز شیخ کا نام بیشتر اخبارات کی زینت بنا رہا ہے۔ شہناز شیخ مطلقہ ہیں اور مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کی خواہاں ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان کی یہ ڈیمانڈ جائز ہے۔ مگر ہم یہ سوچنے پر مجبور ضرور ہیں کہ ایک مسلمان عورت نے یہ ڈیمانڈ کیوں کی اور وہ اس کے لیے کوشاں کیوں ہیں۔ ابھی حال ہی میں ان کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے اپنی شادی (وہ اپنے شوہر کی دوسری بیوی تھیں) اور طلاق کے واقعات کا مفصل حال بتایا ہے۔ ان کے شوہر صاحب نے ایک دن کہہ ہی دیا کہ انہوں نے دوسری شادی اس لیے کی کہ بمبئی میں طوائف کے پاس جانا مہنگا پڑتا ہے اور پھر "طلاق، طلاق، طلاق" کہہ کر انہوں نے شہناز کو گھر سے نکال دیا۔ عورت جو ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے، جس نے اوتار پیغمبر کو جنم دیا ہے۔ جس کے پیر کے نیچے جنت ہے اسے بیوی بنا کر طوائف کی حیثیت سے استعمال کرنا ہر نظریے ہر مذہب اور تہذیب کی رو سے ذلیل ترین فعل ہے۔ اب اگر ایک منکوحہ طوائف بننے پر راضی نہیں ہوتی اور "طلاق، طلاق، طلاق" لے کر عدالت پہنچ جاتی ہے اور مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کی بات کرنے لگتی ہے تو ہمارے "مذہبی معاشرے" میں زلزلہ آجاتا ہے۔

آخر توہین کس حد تک برداشت کی جا سکتی ہے؟ جہاں پر توہین و تذلیل کی حد ختم ہوتی ہے وہیں پر بغاوت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ جہاں پر غلامی کی انتہا ہوتی ہے وہیں پر آزادی کی جدوجہد کی ابتدا ہوتی ہے۔

علامہ اقبال مرحوم نے اپنی مشہور نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ میں ابلیس کی زبان سے کہلوایا

تھا کہ :-

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

۵- جماعت اسلامی اور علماء

جماعت اسلامی (بزعم خویش) جب ایک بااصول جماعت تھی یعنی اپنے اعلان کردہ اصولوں پر عمل کرتی تھی تو اس وقت دوسرے علماء کے بارے میں اس کی جانب سے یہ کہا جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان میں ڈنک رکھ دیا ہے، جس سے دلوں کو زخمی کیے بغیر وہ کوئی بات نہیں کر سکتے۔ (تنقیحات صـ۲۸)

بعد میں جب اپنے اصول ترک کر کے اپنی علماء کو جماعت اسلامی، اپنے جھنڈے تلے جمع کرنے لگی۔ تو بااصول لوگ جماعت چھوڑ کر چلے گئے، ان میں سے ایک جماعت اسلامی کی شخصیت نمبر ۲ یعنی مولانا امین احسن اصلاحی بھی تھے۔ انہوں نے بعد میں جماعت اسلامی سے نکل جانے والوں کو اکٹھا کر کے کام شروع کیا تو اس کام کے کرتا دھرتا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بن گئے۔ انہوں نے بھی سستی شہرت حاصل کرنے کیلئے اپنی علماء کی اوبھگت شروع کی جن کے بارے میں وہ فرمایا کرتے تھے کہ ان کی زبان میں ڈنک ہے۔ کیکن جناب امین احسن اصلاحی صاحب اپنے ملک پر ڈٹے رہے اور اس وجہ سے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے بھی قطع تعلق کر لیا۔ اس کی تفصیل ڈاکٹر اسرار احمد صاحب خود اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:

"مارچ ۸۷ء سے انجمن خدام القرآن کی سالانہ قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوا اور اس میں راقم نے تقریباً تمام مکاتبِ فکر کے علماء کو صدارت یا خطاب کے لیے دعوت دی جسے ان کی اکثریت نے ازراہِ شفقت و عنایت منظور فرما لیا۔ یہ چیز راقم کے اور مولانا کے مابین مزید بُعد و فصل کا سبب بن گئی ان کا فرمانا یہ تھا کہ "ان مولویوں کو سر پہ بٹھا کر کیا لینا ہے؟ ان ہی کے خیالات و تصورات کی تو ہمیں تردید کرنی ہے"! راقم نے اسی بھی خاموشی سے سنا ان سنا کر دیا اس لیے کہ اُس کی طبیعت کا رُخ جیسا کہ اُوپر تفصیل سے بیان ہو چکا، بالکل دوسرا ہے۔ تاہم اُس نے محسوس کر لیا کہ اب مولانا نے مزاج میں تلخی بڑھتی جا رہی ہے۔

(ماہنامہ حکمت قرآن بابت مئی ۱۹۸۷ء صـ۲۴)

محمد اسلام
کراچی

افکارِ پرویز کی صدی

(مسلسل)

اسبابِ زوال امت محترم پرویز صاحب کا مضمون بعنوان اسبابِ زوال امت کئی سابقہ اشاعتوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ قارئین حضرات نے خطوط کے ذریعہ کئی مقامات کی وضاحت طلب کی۔ چنانچہ ان کی وضاحت فرماتے ہوئے موصوف نے لکھا۔

سوال:۔ آپ نے انسان کی مادی ضروریات کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اسکی روحانی ضروریات کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ اسلام کا منتہیٰ انسان کی معاشی زندگی میں توازن پیدا کرنا ہے۔

جواب:۔ انسان کی معاشی ضروریات سے مراد صرف روٹی، کپڑا نہیں بلکہ وہ تمام اسباب و ذرائع ہیں جن سے انسان کے مضمر جوہروں کو کامل نشو ونما کا موقع ملے، یعنی انسان کے اندر جس قدر عمدہ صلاحیتیں ہیں، ان تمام صلاحیتوں کے تکمیل پانے اور برومند ہونے کے مواقع میسّر ہوں۔ معاشی توازن سے یہی مراد ہے اور میرے نزدیک اسلام کا یہی منشاء ہے۔ کیا کسی نظام کا یہ کارنامہ کم معرکہ آراء محیّر العقول اور قابلِ فخر و ناز ہے کہ وہ اس قسم کا معاشی توازن قائم کر دے اور اس نظام کا قیام کسی ایک خطۂ زمین یا انسانوں کے کسی ایک گروہ تک محدود نہ ہو بلکہ اس کا دائرۂ عمل و نفوذ تمام دنیا کے انسانوں کو محیط ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم صبح سے شام تک معاشی مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں مصروفِ سعی و عمل رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود معاشی ضروریات کی اہمیت سے بھی انکار کرتے رہتے ہیں۔ یہ انکار دراصل غمازی کرتا ہے مادی زندگی کے متعلق اس تصوّر کی جو عیسائیت کی رہبانیت اور عجمی تصوّف نے ہمارے ذہنوں میں پیدا کر رکھا ہے اور جس کی رو سے ہم مادی دنیا کو قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔ مادی زندگی اور اس کے تقاضے کوئی ایسی شے نہیں کہ جس کے تمسک سے ہم جھینپے جھینپے محسوس کریں۔ عملاً

ہماری حالت یہ ہے کہ ہم میں سے بڑے سے بڑا روحانیت کا دعویدار بھی تھوڑی تک مادی دنیا کی ضروریات میں غرق ہوتا ہے اور زبان سے ہم میں سے ہر شخص مادی دنیا پر لعنت بھیجتا ہے۔ اسلام اس قسم کی جھجک اور جھینپ کی زندگی کو منافقت کی زندگی قرار دیتا ہے جو سینوں میں ہر وقت ایک کشمکش پیدا کئے رکھتی ہے۔ وہ حقائق کا بے نقاب سامنا کرتا ہے اور ہر حقیقت کا مردانہ وار اعتراف کرتا ہے۔ وہ معاشی خوشگواریوں کو خدا کی نعمتیں قرار دیتا ہے ..... قرآن کے نزدیک حسنِ عمل کا تقاضا ہے کہ وہ فساد انگیز معاشی نظام کو مٹا کر اس کی جگہ عدل اور احسان کا متوازن معاشی نظام قائم کرے۔ جس نظام کا مقصود و منتہیٰ یہ ہو، کیا آپ کے نزدیک وہ نظام کچھ اہمیت نہیں رکھتا؟ اس نظام کے قیام اور قیام کے بعد بقا و استحکام کے لئے انسان کو جس قسم کی جدوجہد کرنی پڑتی ہے کیا اس سے بڑھ کر کوئی اور "روحانیت" بھی ہو سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ لفظ "ثواب" کی طرح روحانیت بھی ایک ایسا لفظ ہے جو آج تک شرمندۂ معنی نہیں ہو سکا۔ بولنے کو ہر شخص یہ لفظ بولے گا لیکن پوچھنے پر کوئی نہیں بتا سکے گا کہ اس لفظ سے اس کا مفہوم کیا ہے۔ وہ بہت دور کی کوڑی لائے گا تو کسی بزرگ کی کرامات گنا دیگا لیکن ان سے بھی بڑھ کر کرامات ہندو سنیاسیوں اور یوگیوں کی سننے اور دیکھنے میں آجائیں گی۔ قرآن نے کہیں بھی روحانیت کا مطالبہ نہیں کیا۔ اس کا مطالبہ ربانی بننے کا ہے اور اس کے معنی نشوونما دینے والے نظام کے حاملین کے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس وقت تصور ہی نہیں کر سکتے کہ وہ نظامِ عدل و احسان اس قدر "روحانیت پرور" ماحول پیدا کر دے گا جس میں ہر انسان اپنی تمام صلاحیتوں کے برومند ہونے کے مواقع یکساں طور پر موجود پائے گا۔ یہی وہ ماحول ہوگا جس میں "زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ یہی وہ ماحول تھا جس کی ایک جھلک آسمان کی آنکھ نے سرزمینِ عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر دیکھی تھی اور جسے دوبارہ دیکھنے کی تمنا میں وہ آج تک سرگرداں پھر رہا ہے۔

سوال: آپ نے لکھا ہے کہ اسلام ایک معاشی نظام قائم کرتا ہے، روس کی اشتراکیت کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ ایک بہترین معاشی نظام قائم کرتی ہے۔ اس نے اس حد تک اس نظام کو عملاً قائم کر کے بھی دکھا دیا ہے۔ پھر اسلام اور اشتراکیت میں کیا فرق ہے؟

جواب: اوّل تو اشتراکیت کے معاشی نظام اور اسلام کے معاشی نظام میں بحیثیت نظام کے بڑا فرق ہے۔ اشتراکیت کے نظام کی بنیاد "مساواتِ شکم" پر ہے اس کے برعکس اسلام کا نظام ربوبیت ایک ایسا متوازن ماحول پیدا کرتا ہے جس میں ہر انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما پانے اور برومند ہونے کے پورے اور یکساں مواقع میسر ہوں۔

لیکن اصل فرق اس منہج و اسلوب اور اس کے نتائج و عواقب میں ہے جس میں اشتراکیت اور اسلام اپنا نظام قائم کرتے ہیں جیسا کہ میں اس سے پیشتر (سلیم کے نام دو خطوط میں) لکھ چکا ہوں، اشتراکیت کا تصورِ حیات یکسر مادّی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اشتراکی موت کے بعد، تسلسلِ حیات کا قائل نہیں۔ نہ ہی وحدتِ انسانیت کا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا جذبۂ محرکہ ہے جس کی بناء پر اشتراکین اپنا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ ان کے نزدیک زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ اس لئے ان کے سامنے مفادِ عاجلہ کے سوا اور مفاد آ ہی نہیں سکتے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ نوعِ انسان سے ہمدردی کا جذبہ وہ قوتِ محرکہ ہے جس کی بناء پر وہ اس قسم کا عالمگیر نظام معیشت قائم کرنے کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہیں لیکن یہ جذبہ تو اخلاقی قدر کے ماتحت آتا ہے اور مادی نظریۂ حیات میں اخلاقی اقدار کا تصور بار ہی نہیں پا سکتا اس لئے اس قسم کا نظام یا تو ہنگامی جذبات کے ماتحت قائم کرایا جا سکتا ہے یا پھر استبداداً۔ اس وقت اشتراکی عوام کو محض سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جذبۂ انتقام کی بناء پر مشتعل کیا جاتا ہے۔ اور یہی جذبہ ان کے اس "جنون" کا ذمہ دار ہے جو ان کی مساعی میں اس قدر جوش پیدا کر رہا ہے لیکن اس قسم کے منفیانہ جذبات پر کسی تعمیری انقلاب کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ کچھ عرصہ کے بعد جب یہ مشتعل انتقامی جذبات فرو ہو جائیں گے تو پھر اس نظام کے قیام کا کوئی سہارا باقی نہیں رہے گا۔ اس وقت اس نئے نظام کے ارباب حل و عقد اپنی قیادت و سیادت بلکہ اقوامِ عالم میں اپنی امامت کے تحفظ اور بقا کی خاطر عوام سے اسطرح میکانکی طور پر اس نظام کے قیام کے لئے کام لیں گے جسطرح ہر دوسرے نظام میں مستبد طبقہ، پچھلے طبقہ سے کام لیتا ہے۔

اس کے برعکس اسلام جس متوازن نظامِ ربوبیت کا قیام چاہتا ہے اس کی بنیاد وحدتِ انسانیت اور تسلسلِ حیات کے غیر متزلزل عقیدہ پر رکھتا ہے (توحید خداوندی پر ایمان کا عملی مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں صرف ایک ہی قانون نافذ العمل ہے جو تمام نوعِ انسانی پر یکساں طور پر حاوی ہے اور جس کے اثر و نفوذ کا دائرہ طبعی زندگی کے اختتام کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے بعد بھی قائم رہتا ہے) اس عقیدہ کی بنیادوں پر وہ ایک عملی پروگرام کی عمارت اٹھاتا ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس پروگرام میں شریک ہونے والے کی اپنی ذات میں ایک تغیر واقع ہو جاتا ہے۔ اس نفسیاتی تغیر کا نام تعمیرِ سیرت یا استحکامِ ذات ہے۔ داخلی طور پر نفسِ انسانی میں یہ تغیر واقع ہوتا جاتا ہے اور خارجی دنیا میں وہ نظامِ ربوبیت وجود کوش ہوتا چلا جاتا ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ لہٰذا اس پروگرام کی رُو سے انسان کی داخلی اور خارجی، دونوں دنیاؤں میں ربوبیت کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ عربی لغت کی رُو سے ربوبیت (تربیت) کے معنی وہ طریقِ نشوونما ہے جس سے آہستہ آہستہ تدریجاً پانی

کا قطرہ آغوشِ صدف میں گہر بن جاتا ہے اس استحکامِ ذات سے انسان حیاتِ جاوید حاصل کر لیتا ہے اور موت اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں کر دیتی۔ اس نظام کی اطاعت اکراہاً اور استبداداً نہیں کرائی جاتی بلکہ یہ رضاکارانہ خواہش نفسِ انسانی کی گہرائیوں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہے، یعنی اس کی فطری خواہش بن جاتی ہے یا یوں کہیئے کہ یہ اطاعت اس نظامِ ربوبیت کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ جب کھجور پک کر خود بخود شاخ سے الگ ہو کر نیچے ٹپک پڑے تو اس کی یہ کیفیت اطاعت کہلاتی ہے۔ اس لئے اسلام کے نظامِ ربوبیت میں ہر "تربیت یافتہ نفس" (یعنی جس نفسِ انسانی کی نشوونما اس نظامِ ربوبیت کی رُو سے ہوگی) اس نظام کی اطاعت (بلکہ یوں کہیئے کہ اس کے قیام و استحکام کے لئے جدوجہد میں شرکت) کا جذبہ اپنی ذات میں اُبلتا ہوا پائے گا۔ اسلام کے متوازن معاشی نظام سے مراد اس قسم کا نظامِ ربوبیت ہے، نہ کہ محض روٹی کے مسئلہ کا حل اور ایسا حل جو مقصود بالذات بن کر رہ جاتا ہے کہ جب یہ مسئلہ حل ہو جائے تو اس کے بعد انسانی نشوونما ارتقاء کے میدان بھی ختم ہو جائیں اور اس لئے اس کی سعی و عمل کے محرکات کے چشمے بھی سوکھ جائیں۔

جولائی ۱۹۵۰ء

لمعات اس ماہ کے لمعات میں ایک قاری کے استفسار کہ جماعتِ اسلامی ملک میں قانونِ شریعت کا نفاذ چاہتی ہے اور طلوعِ اسلام کا مسلک بھی یہی ہے تو پھر طلوعِ اسلام جماعتِ اسلامی کی مخالفت کیوں کرتا ہے، محترم پرویز صاحب نے لکھا:۔

سب سے پہلے یہ کہا جاتا ہے کہ جماعتِ اسلامی احیاءِ دین کی مدعی ہے اس لئے اس کی مخالفت درست نہیں لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا کسی فرد یا جماعت کا یہ دعوےٰ کہ وہ دین کا احیاء یا قانونِ شریعت کا نفاذ چاہتی ہے تنہا اس امر کی دلیل بن سکتا ہے کہ اس فرد یا جماعت کی مخالفت دین اور شریعت کی مخالفت ہے؟ قرنِ اوّل سے آج تک مسلمانوں کی تاریخ پر غور کیجئے، کتنے فتنے تھے جو خود مسلمانوں میں اسلام کی تخریب کے لئے اٹھے، کیا ان میں سے کوئی بھی ایسا تھا جس نے یہ دعوےٰ کیا ہو کہ میں دین کو مٹانے یا شریعت کو نیست و نابود کرنے کے لئے میدان میں آیا ہوں؟ ان میں سے ہر ایک یہی دعویٰ لے کر اٹھا تھا کہ وہ دین کا احیاء اور شریعت کے نفاذ کے لئے مصروفِ سعی و عمل ہے۔ مسلمانوں کا ہر فرقہ اسی دعوے کی بنیادوں پر اٹھا اور اسی دعوت کے سہارے کھڑا رہا۔ اور تو اور، مدعیانِ نبوت تک نے یہ نہیں کہا کہ وہ اسلام کو مٹانے اور شریعت کو تباہ کرنے کے لئے مبعوث ہوئے ہیں۔ وہ بھی اٹھے تو اپنا دل تھامے ہوئے گویا وہ قوم کے درد میں ڈوبا جا رہا ہے اور یہ کہتے ہوئے کہ وہ تجدیدِ دین اور احیاءِ شریعت کے لئے "مامور" ہوئے ہیں۔ ان

حالات کے تحت کسی جماعت کے برحق ہونے کے لئے محض یہ دلیل کہ اس کا دعویٰ شریعت کا نفاذ ہے کچھ وزن نہیں رکھتی۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ وہ کونسی شریعت ہے جس کا نفاذ وہ چاہتی ہے اور وہ کیا مقصد ہے جس کے لئے وہ اس تحریک کو آگے بڑھا رہی ہے۔

جماعتِ اسلامی کا آغاز اس دعوے سے ہوا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان صرف پیدائشی مسلمان ہیں انہیں صحیح معنوں میں مسلمان بننے کے لئے جماعت اسلامی کے امیر کے ہاتھ پر تجدید ایمان کرنی چاہیئے۔ چنانچہ اس جماعت کے پہلے اجتماع میں اس تجدید ایمان کا مظاہرہ بھی کیا گیا۔ اس سے واضح ہے کہ اس جماعت کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کے اراکین یا کم از کم اس کے اربابِ بست وکشاد سچے معنوں میں مسلمان ہیں اور انکی زندگی وہ معیار ہے جس پر ہر سچے مسلمان کو پورا اترنا چاہیئے۔ چنانچہ جماعتِ اسلامی بار بار اس دعوے کو دہراتی رہتی ہے کہ "اس کی قیادت بہترین افراد کے ہاتھوں میں ہے" یہاں تک کہ اس جماعت کے ایک موید مجلّے نے یہ بھی لکھا تھا کہ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اپنے آپ کو چالیس کروڑ انسانوں میں تنہا پاتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی معیاری زندگی کے مدعیوں میں کم از کم دیانت تو ضرور ہونی چاہیئے۔ اب دیکھئے کہ اس اعتبار سے واقعات ہمیں کس نتیجے پر پہنچاتے ہیں۔

اس حقیقت سے کون بے خبر ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے جماعت اسلامی تحریک پاکستان کو غیر اسلامی تحریک قرار دیتی تھی یہاں تک کہ وہ اس تحریک میں چھوٹے سے چھوٹے تعاون کو بھی تعاون علی الاثم والعدوان (گناہ اور معصیت کے کاموں میں معاونت) تصور کرتی تھی چنانچہ یہ جماعت آخر تک تحریکِ پاکستان کی شدت سے مخالفت کرتی رہی۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد یہی جماعت اپنے آپ کو پاکستان کی سچی بہی خواہ بنا رہی ہے۔ ترجمان القرآن مارچ ۱۹۵۰ء کے اشارات کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ "پاکستان کے تین سچے بہی خواہ جو تحریکِ اقامتِ دین کی سربراہ کاری کے جرم میں حوالۂ زنداں کئے گئے تھے (پاکستان کے یہ تین سچے بہی خواہ ابوالاعلیٰ مودودی، امین احسن اصلاحی اور میاں طفیل محمد ہیں) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو تحریک ابھی کل تک خلافِ اسلام قرار دی جا رہی تھی وہ اپنی کامیابی کے بعد کس طرح عین اسلام قرار پا گئی؟ وہی پاکستان جسے اس وقت "زہر بلا حلوہ" کہا جاتا تھا اپنے قیام کے بعد کسطرح منزل من اللہ مائدہ بن گیا جو خاص طور پر مقدسین کے اس طائفہ کے لئے آسمان سے اترا ہے اور جسے کسی "غیر مقدس" کو چھونے تک کی اجازت نہیں دی جا رہی ہے۔ کیا دیانتداری اسی کا نام ہے؟

اور آگے بڑھیئے۔ پاکستان کی مخالفت میں یہ جماعت دلیل یہ لایا کرتی تھی کہ مسلمانوں کی اپنی تعمیرِ سیرت اور تطہیرِ کردار کی فکر کرنی چاہیئے جب یہ ہو جائے گا تو سلطنت خود بخود ان کے پاؤں چومے گی۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ خارجی حوادث اور ہنگامی واقعات سے حالات

ایسے پیدا ہو رہے ہیں کہ ہندوستان سے انگریزی حکومت کی بساط سمٹتی جا رہی ہے اور اس کی جگہ ہندوؤں کی حکومت کی بساط ساتھ کے ساتھ بچھتی جا رہی ہے اگر مسلمانوں نے اس وقت اپنی جداگانہ آزادی کے لئے جدوجہد نہ کی یا اس میں تساہل برتا تو انہیں صدیوں تک ہندوؤں کا غلام رہنا پڑے گا۔ اس لئے حالات کی تبدیلی کی بناء پر ضروری ہے کہ حصولِ پاکستان کی تحریک کو کامیاب بنایا جائے۔ جب اپنی حکومت قائم ہو جائے گی تو تعمیرِ سیرت اور تطہیرِ کردار کے لئے تمام اسباب میسّر ہو جائیں گے۔ اس وقت پورے اطمینان کے ساتھ یہ سب کچھ کیا جا سکے گا۔ اس پر ان کا جواب یہ تھا کہ تعمیرِ سیرت کے بغیر مسلمانوں کی آزادی اور ہندوؤں کی غلامی برابر ہے اس لئے اصل کام تعمیرِ سیرت ہے جس کے بغیر سیاسی جد وجہد میں حصہ لینا گناہ کا کام ہے۔ یہ تھا ان معیاری مسلمانوں کا مسلک قیامِ پاکستان سے قبل۔ حصولِ پاکستان کے بعد یہ خود عملی سیاست کے میدان میں آ اُترے اور مسانید حکومت و اقتدار پر متمکن ہونے کے لئے پورے جذب و انہماک سے مصروفِ عمل ہو گئے۔ کسی نے ان پر اعتراض کیا ہے کہ جماعتِ اسلامی کا اصلی کام تو تعمیرِ سیرت تھا یہ مسلمانانِ پاکستان کی سیرت کی تبدیلی کے کام کو چھوڑ کر انتخابی معمّوں کے پیچھے کیوں پڑ گئی؟ اس کے جواب میں ترجمان القرآن بابت جون کے اشارات میں لفظاً وہی کچھ کہا گیا ہے جو تحریکِ پاکستان کے حامی، جماعتِ اسلامی سے قیامِ پاکستان سے پہلے کہا کرتے تھے۔ چند فقرے ان ہی کے الفاظ میں دیکھئے۔ فرماتے ہیں:-

جماعتِ اسلامی ابتدائی تیاری (یعنی تعمیرِ سیرت) کے دور کو لمبا کرنا چاہتی تھی لیکن حالات نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے میدانِ کار میں طلب کر لیا۔ ہمارے ماحول میں اسلامی اور غیر اسلامی فکر کے درمیان جو آویزش دھیمی دھیمی چلی آ رہی تھی وہ تقسیمِ ہند سے قبل ہی خاصی تیز ہو چکی تھی لیکن آزادی اور تقسیم کے بعد وہ معاً انتہائی اشتعال پر پہنچ گئی۔ اب جب کہ حالات بتا رہے ہیں کہ اس کش مکش کا فیصلہ ادھر یا ادھر بہت جلد ہونے والا ہے اور آزادی کے بعد کے ابتدائی پانچ سال (یا زیادہ سے زیادہ دس سال) اسلام کے لئے بالکل فیصلہ کُن ہیں تو جماعتِ اسلامی کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ وہ ہمہ تن "عشق" بنے اور بے خطر آتشِ نمرود میں کود جائے اور اس موقع پر عقل کو محوِ تماشائے لبِ بام چھوڑنے کے علاوہ کوئی دوسری صورت تھی ہی نہیں۔ تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک انتہائی موڑ مڑنے والی ہے اور اگر اُسے غلط راستے پر جانے سے روکنے کے لئے فوراً ہی ایک منظم قوت اس کے آڑے نہ آئے تو پھر یہ دریا الحاد کے رُخ بہہ جانے کے بعد جب کنارے کاٹتا ہوا اپنی رودگاہ کو گہرا اور اپنے پاٹ کو چوڑا کر چکے گا تو پھر اسے ایک نئی

سمت میں موڑنا دنیا کا محال کام ہوگا۔ یہ اللہ کا احسان ہے کہ جماعت اسلامی کے راہنماؤں نے اپنے ماحول، اپنی حریف طاقتوں، اپنے دور کی تاریخ اور اپنے وقت کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمدؐ" کا ڈھنگ اختیار نہیں کیا کہ چاہے تمدن اور سیاست کی ساری بازی شاطر الحاد جیت جائے لیکن وہ ایک گوشہ میں بیٹھے تعمیرِ سیرت کے کام میں لگے رہیں۔ جب اسلام دشمن طاقتیں زندگی کے حرم کے دروازے توڑ کر اس پر اپنا جھنڈا لہرانے کے لئے آخری ہلہ بول رہی ہوں تو ان لوگوں کی سیرتیں اور تقویٰ کس کام کا جو اپنی جانوں کو بچانے کے لئے گھروں کے دروازے بند کئے بیٹھے رہیں۔

جماعتِ اسلامی کے اس مسلک اور اس مسلک کی تائید میں ان کے پیش کردہ دلائل کو غور سے دیکھئے اور پھر ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر اس پر نظر ڈالئے کہ جب حصولِ پاکستان کی تحریک کے دوران ان لوگوں سے یہی کچھ کہا جاتا تھا تو وہ اس قسم کے مسلک کو کسقدر غیر اسلامی اور اس قسم کے دلائل کو کس قدر پُر فریب بتایا کرتے تھے ان کے نزدیک خواہ سارے کے سارے مسلمان ہندوؤں میں جکڑے جاتے لیکن تعمیرِ سیرت کا کام موخر نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ لیکن آج جب ہوسِ اقتدار انہیں الیکشن لڑنے کے لئے کشاں کشاں کھینچ رہی ہے تو تعمیرِ سیرت کے کام کو چھوڑ کر میدانِ سیاست میں ان کا ہر قدم اسوۂ ابراہیمی کے اتباع میں ہمہ تن عشق بن جاتا ہے اور تعمیرِ سیرت کے "عقلی" تقاضوں کو بے محابا محوِ تماشائے لبِ بام چھوڑ دیا جاتا ہے یہ ہے دیانتداری کا مفہوم جماعتِ اسلامی کی لغت میں!

ایک قدم اور آگے بڑھیئے۔ جماعتِ اسلامی غیر اسلامی حکومت کی عدالتوں کی طرف رجوع کرنے کو تحاکم الی الطاغوت یعنی اپنے مقدمات کے فیصلوں کے لئے غیر خدائی قانون کی طرف رُخ کرنا) قرار دیا کرتی تھی۔ اور اپنے اس "تقویٰ" کے اظہار میں اس درجہ شدت برتتی تھی کہ عدالتی کاروبار سے متعلق ملازمتوں تک کو حرام کی روزی قرار دیتی تھی۔ پاکستان میں ابھی تک وہی عدالتی نظام کارفرما ہے جسے یہ جماعت طاغوتی نظام کہا کرتی تھی۔ لیکن اب اسی جماعت کی حالت یہ ہے کہ مودودی صاحب اور انکے دو رفقائے کار کی نظر بندی کے سلسلہ میں ان کا مسلسل تقاضا یہ رہا کہ

> حکومت ان کے خلاف سوچ کر متعین جرم عائد کرے اور پھر اسے باقاعدہ عدالت کے سامنے لے آئے جو ملزم کو جوابِ دعویٰ پیش کرنے کا پورا پورا موقع دے اور پھر پبلک لاء کے ماتحت معاملہ کا باقاعدہ فیصلہ ہو۔
>
> (ترجمان القرآن بابت مارچ ۱۹۵۰ء)

"باقاعدہ عدالت" کی تصریح کرتے ہوئے ترجمان القرآن نے لکھا ہے کہ سیفٹی ایکٹ اور سیفٹی آرڈیننس

کے ماتحت کارروائی باقاعدہ عدالتی کارروائی نہیں کہلا سکتی۔ باقاعدہ عدالت وہ ہے جو عام قانون کے ماتحت عدالت کی حیثیت رکھتی ہے۔

خود مودودی صاحب نے اپنی پچھلی پریس کانفرنس میں موجودہ حکومت پاکستان کو غیر اسلامی حکومت قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس حکومت کا عدالتی نظام وہی طاغوتی نظام ہے جس کی طرف رجوع کرنے کو دوسروں کے لئے کفر کا موجب بتایا جاتا تھا۔ لیکن جب معاملہ خود اپنی ذات کا آپڑا تو بار بار تقاضا کیا جاتا رہا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ اسی طاغوتی عدالت سے ہونا چاہیئے اور وہ بھی قرآنی قانون کے ماتحت نہیں بلکہ موجودہ "پبلک لاء" کے ماتحت۔

یہ ہے وہ جماعت جس کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کی زندگیوں نے عہدِ صحابہؓ کے سچے اسلام کے نمونوں کو دوبارہ اجاگر کر دیا ہے۔

ایک قدم اور بھی آگے بڑھیے۔ آپ جماعتِ اسلامی کے لٹریچر کو دیکھئے۔ اس میں ایک ایک صفحہ پر آپ کو "کتاب وسنّت" کی طرف دعوت اور "اطاعت خدا ورسول" کی طرف رجعت کا بلند آہنگ دعویٰ ملے گا۔ سنّت یا اطاعتِ رسولؐ سے ان کی مراد یہ ہے کہ جو کچھ احادیثِ نبویؐ میں درج ہے اس کی اطاعت عین دین ہے چنانچہ ہر اس فرد یا جماعت کے خلاف جہاد کا اعلان کرتے رہتے ہیں جو روایات کو قرآنی روشنی میں پرکھنے کی جرأت رکھتا ہو۔ اپنے اس مسلک سے یہ لوگ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ہم ہمہ تن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، یہ دعوے ہے اور دوسری طرف حالت یہ ہے کہ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ الیکشن لڑنے کے لئے جاگیرداروں اور زمینداروں سے ساز باز ضروری ہے تو جاگیرداری اور زمینداری کو عین اسلام بتانے کے لئے کتابوں پر کتابیں لکھ ماریں۔ قرآن تو ان لوگوں کے نزدیک دین میں سند کی حیثیت ہی نہیں رکھتا۔ اصلی سند ہیں احادیث۔ لیکن بدقسمتی سے ایسی احادیث بھی موجود ہیں جو زمین کو بٹائی پر دینے کی مخالفت کرتی ہیں۔ یہ مقام ذرا دشوار تھا۔ قرآن سے بھاگ کر۔ روایات کے دامن میں پناہ لینے کے لئے آئے لیکن دیکھا کہ زمینداری کے جواز میں یہاں بھی پناہ نہیں مل سکتی۔ آپ متعجب ہوں گے کہ احیاء سنّت کے یہ مدعی اب کون سی راہ فرار اپنے لئے پائیں گے۔ لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات ہی نہیں۔ جن کے نزدیک مذہب صرف ایک ذریعہ ہو حصولِ مقصد کا ان کے لئے گریز کے ہزار دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جناب امیر جماعتِ اسلامی نے نہایت مجتہدانہ شان سے فرمایا کہ ان احادیث میں دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کچھ اور تھا اور وہ روایات میں کسی اور طرح بیان ہو گیا۔

ان روایات کے راوی صحابۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ یا تو یہ صحابہؓ ارشاد رسالت مآب کو صحیح طور پر سمجھ ہی نہ سکے اور یا (معاذ اللہ) انہوں نے دانستہ کچھ کا کچھ روایت کر دیا۔ آپ شاید یہ سوال کریں کہ خود مودودی صاحب کو اس کا علم کیسے